

## ایک دوست کی روانگی

ایک دن حملہ آوروں نے چند ہندو نو جوانوں کو ہسپتال آنے کو کہا۔ لڑکوں کو بتایا گیا کہ اُن کا راشن وہاں سے تقسیم ہوگا۔ ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کسی کو دو ہفتوں کے لیے اکٹھا راشن دیا گیا ہو، اس لیے راشن کی تقسیم کی اس پیشکش کو ہر لحاظ سے ایک اہم واقعہ سمجھا گیا۔ قصبے میں کوئی بھی آدمی بلکہ ہزار میں سے ایک بھی حتیٰ کہ وہ بھی جسے یہ سازش لگ رہی ہو، وہاں نہ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

تاہم بعد میں یہ ایک سازشی جال ہی ثابت ہوا۔ جب وہ ہسپتال پہنچے تو مسلح حملہ آوروں نے اُنہیں حیرت میں ڈال کر محصور کر لیا اور ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگالیا۔ جب وہ گھنٹوں تک واپس نہ آئے تو اُن کے رشتہ داروں کو پریشانی ہوئی اور وہ یہ جاننے کے لیے کہ کیا ہوا ہے ہسپتال چلے گئے۔ لیکن وہاں اُنہیں بھی پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

نانک چند ہسپتال جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اُسے اچانک راستے میں خان مل گیا۔ خان نے اُسے واپس گھر بھیج دیا اور اُسے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں گھر سے باہر نہ آئے۔

دوسرے دن شہر پر ایک منحوس سی خاموشی چھائی رہی۔ ہر شخص محتاط قدموں سے چل رہا تھا اور اُس کے چہرے پر دکھ اور افسوس دکھائی دیتا تھا۔ وہ یہ احساس دلاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ اب وہ اپنی زندگی کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھتے تھے جیسے اُن کے چہروں پر غمناک سنجیدگی اور بے حسی چھائی ہوئی ہو۔ لیکن کسی قسم کا اظہار نہیں کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا خوف مشترک ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ باتیں کرتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے لیکن خاموش سرگوشیاں پھر بھی ہر طرف گھوم جاتی تھیں۔

مجھے جس بات کا علم نہیں تھا وہ پہلے ہی خبر کی شکل میں پھیل چکی تھی۔ مجھے اس کے بارے کئی گھنٹے بعد

معلوم ہو۔ وہ ہندو جنہیں ہسپتال میں قید کیا گیا تھا اُن سب کو گزشتہ مہینے بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ مقامی

مسلمانوں نے یہ کہانی تفصیل سے سُنائی کہ انہیں کس طرح قتل کیا گیا۔ وہ سارے تقریباً ساٹھ کے لگ بھگ تھے۔ انہیں بے بسہ سردرات میں بنگا کر کے باہر کھڑا کیا گیا اور کہا گیا کہ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ پھر سب کو کلمہ پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ قطار کے پیچھے ایک قبائلی خاتون انتہائی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی اور جب اُس کے سامنے والا شخص کلمہ پڑھ چکتا تھا تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اور دانت کچکا کر خنجر پورے زور سے اُس کے دل میں اتار دیتی تھی۔ میں آسانی سے اُس عورت کے چہرے پر مذہبی فریضے کی ادائیگی سے حاصل ہونے والے اطمینان کا تصور کر سکتی تھی۔ کیوں کہ عالمگیر سطح پر دیگر جنونیوں کا شیوہ بھی یہی رہا ہے جب تک کہ اسے حقیقی اور مدلل سمجھا جاتا رہا۔ انسانی خون کے منظر نے اُن کے احساس کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ اب وہ اپنی خود فریبی کو بھی پوری طرح فراموش کر بیٹھے تھے۔

قتل ہونے والوں میں سے ایک آدمی چمن لال کے اس گھر میں رہتا تھا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں اور جب اُس کی بیوی نے یہ خبر سنی تو اُسے یقین نہیں آیا۔ اُسے موقعہ واردات پر لے جایا گیا تا کہ وہ خود دیکھ سکے کہ کیا ہوا ہے اور اُس کی شہادت شک و شبہ سے بالا تھی۔

اُسی دن دو پہر کو خان مجھے ملنے آیا اور میں نے اُس سے اس حادثہ کا ذکر کر دیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے اس کے بارے معلوم ہے۔ اُس نے سارے معاملے کو محض افسانہ قرار دے کر ٹھپ کر دیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اس پر کیسے یقین کر سکتی ہوں۔

میں نے جواب دیا۔ ”ایک خاتون جو اسی گھر میں رہتی ہے اس حادثے کو جسے اُس نے خود دیکھا ہے اور وہ اس ثبوت کو اپنی ساری زندگی یاد رکھے گی۔“

خان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کہنے لگا ”اپنے ملازم سے کہیں کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ میں خود وہ لاش دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ محض دلچسپ افواہیں ہیں۔“ خان کے ذہن میں ایک کشمکش تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ میں اُس وقت اُس سے یہ ذکر نہیں کر سکتی تھی جب تک مجھے اس کی صداقت کا یقین نہ ہوتا اس لیے وہ اس حادثے کو بڑی سنجیدگی سے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس سے قبل کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس معاملے میں اُسے انتخاب کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ وہ مجھے بھی جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اس دردناک کہانی کے کسی بھی حصہ کا سامنا کرنا بھی اُس کے لیے مشکل تھا۔ وہ یہ وعدہ کر کے واپس چلا گیا کہ وہ دوبارہ شام کو آئے گا۔

وہ شام کو واپس آیا اور اُوم، جودھا اور چند دوسروں کو ساتھ لے کر حادثے والی جگہ پر گیا۔ تقریباً ایک

گھنٹے کے بعد وہ سارے واپس آ گئے اور خان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ کس وجہ سے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

اُس نے ملازموں کو میرے سامنے لایا اور کہا۔ ”ان سے پوچھیں کہ اگر ان کو وہاں کوئی چیز نظر آئی ہو۔“ جب میں نے اپنا رخ ملازموں کی طرف کیا تو انہوں نے بھی کہا کہ انہیں کوئی چیز نہیں ملی۔ خان کے لیے صورت حال اچھی تھی اور اُس نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”وہاں صرف خون کے چند قطرے تھے اور میں صبح اس بات کا پتہ چلا لوں گا کہ وہ وہاں کیسے آئے۔“

دوسری صبح خان پھر آیا اور مجھے بتایا کہ اُس نے اُس پہاڑی کو دوبارہ دیکھا۔ اُس نے کہا یہ سچ ہے کہ وہاں وزیر کے حکم سے ایک آدمی کو قتل کیا گیا ہے اور کہانی یہ ہے کہ شیخ عبداللہ جو کشمیر کا وزیر اعظم ہے، نے وزیر کے خاندان کے کچھ لوگوں کو قید کیا ہوا ہے اور انہیں اذیت دلوں رہا ہے۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ ایک ہندو قیدی کو قتل کر کے وزیر نے جوابی کارروائی کی ہے۔

میں نے خان کو بتایا۔ ”اگر وزیر کے خاندان کے بارے کہانی سچ بھی ہو تو اُسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ یہاں ہندوؤں کو قتل کر کے اُن کی قسمت نہیں بدل سکتا۔“ تاہم خان نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اصل میں شیخ عبداللہ کی انتظامیہ ہی پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہندوؤں کی حالت زار کی ذمہ دار ہے۔ یہ میرے اور خان کے درمیان ایک پرانا جھگڑا تھا۔ میں اُسے کبھی قائل نہیں کر سکی کہ دو غلطیاں ایک دوسری کو کاٹ کر منسوخ نہیں کر سکتیں بلکہ ایک دوسری کے رد عمل میں غموں میں اضافہ کرتی ہیں۔

شہر میں تناؤ کی کیفیت کچھ یوں جاری تھی جیسے روشندان کے بغیر کمرے میں تعفن پھیلا ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک اور حادثہ ہوا۔ ہندوؤں کو جلوس کی صورت میں مسجد لے جایا گیا اور انہیں کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ مذہب کی ان جبری تبدیلیوں کی خبریں سن کر قریبی گاؤں کے مسلمانوں نے ہندوؤں کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور انہیں اپنے گھروں میں پناہ دینے کی پیشکش کی۔

ناٹک چند بالکل اس حق میں تھا کہ ہمیں یہاں سے نکل کر کسی قریبی گاؤں میں پناہ لے لینی چاہیے۔ لیکن خان نے اُسے یقین دلایا کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گا۔

ہندو مسلسل اضطراب اور بے اطمینانی کا شکار تھے اگرچہ اُن سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو اُن کی زمینیں اور جائیدادیں انہیں واپس لوٹا دی جائیں گی۔ اوم بھی اس بات کے حق میں تھا کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اُس نے کہا کہ۔ ”یہ محض قسمت ہے کہ ہم اب تک بچے ہوئے ہیں لیکن یہ صورت حال

ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی۔“ تاہم وہ میری خواہشات کے احترام میں وہیں ٹھہرنے پر رضامند ہو گیا۔

ایک پولیس آفیسر ایک دن گھر آیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اُس روز دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کلمہ پڑھنے کے لیے مسجد میں کیوں نہیں گئی تھی۔ آفیسر جانتا تھا کہ خان ہمارے ساتھ بہت ہمدردی رکھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں اُسے بتا دوں گی، جو میں نے اُسے بتا بھی دی۔

ایک دن جب خان بھی گھر میں موجود تھا ایک دوسرا پولیس آفیسر مجھے ملنے کے لیے آیا۔ وہ اکثر میرا حال پوچھنے کے لیے آیا کرتا تھا لیکن آج خان کی موجودگی میں اُس نے بے آرامی سی محسوس کی اور زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا۔ تاہم خان کے چلے جانے کے بعد وہ دوبارہ آیا اور کہا۔ ”شاید آپ کو احساس نہیں کہ یہ خان کتنا خطرناک آدمی ہے۔ یہی تھا جس نے چند دن پہلے آپ کے بنگلے میں قتل عام کا حکم دیا تھا۔ شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں کبھی بھی اُس پر اتنا اعتماد نہ کرتا۔“

”لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ نے ہماری دیکھ بھال کے لیے کیا کیا ہے؟ ہمیں دن میں کتنی ہی بار بھاگ کر بند کمروں میں چھپنا پڑتا ہے۔ قبائلی حملہ آور دھرمسالہ کیمپ سے بھی عورتیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ خان ہی ہے جس نے یہاں ہمارا قیام ممکن بنایا ہے۔ میں اپنے بارے آپ کی فکر مندی کی قدر کرتی ہوں لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کھیل کھیل رہا تھا لیکن میں نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

پولیس آفیسر دراصل اس گھر میں خان کا سامنا کر کے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خان کے ساتھ اُس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ جب پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے حکام نے اس پولیس آفیسر سے مذہب کی جبری تبدیلی، ہندو خواتین کے اغواء اور اُن کے رشتہ داروں کے اُتاپتا کے بارے معلوم کیا تو اُس نے سارا الزام قبائلیوں کے ذمہ توپ دیا۔ جب کہ پاکستانی آفیسر بھی ان واقعات کے اتنے ہی ذمہ دار تھے جتنے کہ قبائلی۔ تاہم مظفر آباد کے مقامی مسلمان ہندوؤں کے خلاف دشمنی میں سرگرم نہیں تھے۔ بلکہ بعض اوقات مددگار بھی ثابت ہوتے رہے۔

ایک دن میں یہ سُن کر کہ خان مظفر آباد چھوڑ رہا ہے بہت بددل ہوئی اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ”مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسی چیز دیں جو میں گھر لے جاؤں تو آپ کی یاد دلاتی رہے۔“ میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ درخواست کرتے وقت اُس کے ذہن میں میرے شوہر کا ایک ”کھیس“ (Khes) تھا۔ میں نے اکثر اس کے بارے اُس سے بات چیت کی تھی



اور اُسے بتایا تھا کہ میں اُس کو سنبھال کر رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اب جب اُس نے مانگ ہی لیا تو میں انکار نہ کر سکی۔ میں اُن آنسوؤں کو بھی نہ روک سکی جو صبر و ضبط کے بند توڑ کر بہہ نکلے جب میں نے وہ ”کھیس“ خان کے حوالے کیا۔ مجھے اپنے شوہر کا خیال آیا اور افسوس بھی ہوا کہ خان جارہا تھا۔ اُس نے میری تصویر کی نقل بھی مانگی لیکن وہ میرے پاس نہیں تھی اس لیے میں نہ دے سکی۔ میں نے اُس سب کے لیے جو اُس نے ہمارے لیے کیا اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے کہا۔ ”میں نے آپ کو کئی بار کہا ہے کہ آپ میرے ساتھ کابل چلیں۔ وہاں سے آپ کو ہندوستان بھیجنا میرے لیے آسان ہو جائیگا لیکن آپ نے میری بات نہیں سنی۔“

میں کبھی اس بات کی وضاحت نہیں کر سکی کہ شروع ہی سے خان نے میرے ساتھ اس قدر مہربانی کا سلوک کیوں روا رکھا۔ بہر حال یہ ہوتا ہے کہ کسی ایسے آدمی کی نیکی جس سے اس کی توقع نہ ہو، حیران کر دیتی ہے اور ایک غیر معمولی اور مستقل انسانی رشتے کی بنیاد بن جاتی ہے۔ میں نے کبھی کبھی محسوس کیا ہے کہ خان مجھ پر اس لیے مہربان تھا کیوں کہ وہ اپنی زندگی کے کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات اور حادثات کی یادوں کو جو اُس کے ضمیر کے لیے بوجھ بنے ہوئے تھے، پرے پھینک کر آسودگی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کبھی اپنی ذہنی کشمکش کے بارے مجھے نہیں بتایا۔ میں صرف اُس کا اندازہ ہی کر سکتی تھی۔ اُسے شاید اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں بعد میں اُسے ایسے اعتماد کے بارے پچھتا نا نہ پڑ جائے جو کسی عاقبت نا اندیش لمحے میں کیا گیا ہو، جس کے لیے اُسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔ اُس کی سیاست اور اس کے نزدیک اس کی اہمیت کی وجہ سے میں اُس کے بارے زیادہ کچھ نہیں جان سکی۔

میں نے اُسے بتایا کہ جب میں قیدی ہوں تو میں بھاگ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ واقعی رہنا چاہتی ہیں تو میں آپ کے لیے اپنی پوری کوشش کروں گا۔“ اُس نے کہا،

وہ دوسرے دن ایک نوٹس لے کر واپس آیا جو سُرخ سیاہی سے تحریر کیا ہوا تھا اور اُس کی تحریر مندرجہ

ذیل تھی:

”کوئی بھی شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اجازت کے بغیر اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ خلاف

ورزی کرنے والے کو سارے قبائلی ایریا کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

آغا جان خان

قبائلی لیڈر

قبائلی ہمیشہ سے مضبوط نسلی غرور اور وفاداری کے حامل رہے ہیں۔ سُرخ سیاہی خون کے رنگ کی ترجمانی کرتی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”یہ نوٹس میری غیر حاضری میں آپ کی حفاظت کرے گا۔ یہاں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو نظر انداز کریں گے۔“ پھر وہ باہر گیا اور نوٹس کو دروازے پر چسپاں کر دیا۔ اب جب ہم نے اُس کے دستخط پڑھے تو ہمیں احساس ہوا کہ خان کتنا اہم آدمی تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے ہم سب کو فرداً فرداً الوداع کہا۔

پولیس آفیسر مجھے یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ خان ہی ہندوؤں کے قتل عام کا ذمہ دار تھا۔ جب وہ چلا گیا تو اصلی مجرم بھی دریافت کر لیے گئے۔ یہ راز کھلا کہ ڈاکٹر اور اُس کے لوگ اس سارے قتل عام کے ذمہ دار تھے۔

اپنی روانگی سے ایک ماہ بعد خان نے مجھے لکھا:

”میری پیاری بہن جی! براہ مہربانی میری طرف سے آداب قبول کریں۔ میں بحفاظت گھر پہنچ گیا ہوں اور ہمیشہ آپ کو اور آپ کے بچوں کو یاد رکھوں گا۔ خدا آپ پر رحم کرے۔“

آپ کا مخلص

آغا جان خان،

بنوں۔ کوہاٹ

میں نے بھی اُسے واپسی خط لکھا لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ شاید ہمارے خطوط سنسر کی نذر ہو گئے۔ نوٹس جو اُس نے ہمارے دروازے پر چسپاں کیا تھا ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ کبھی کوئی گھر میں داخل نہیں ہوا۔ میرے مظفر آباد چھوڑنے کے بعد بھی بے شمار لڑکیوں نے اُسی گھر میں پناہ لی اور وہ قبائلیوں سے محفوظ رہیں۔ بعد میں نائک چنداُن سب کو ہندوستان لے آیا۔



## سویرے سویرے کے ملاقاتی

بسا اوقات ہمارے لوگوں کو گرفتار کرنے والے (Captors) بھی حیرت انگیز طور پر ہمدردی اور نرمی کا اظہار کرتے تھے۔ اگر اُن کے اسیر اُن کے بارے اچھے الفاظ کا استعمال کر دیں تو وہ اپنے آپ کو مزید بہتر بنانے کو کا سوچ سکتے تھے۔ اکثر لوگ جو دوسروں سے اچھے ہوتے ہیں تو وہ دراصل اپنی ذات کو مطمئن کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اُنچائی پر محسوس کرتی ہے۔ تاہم اُس میں نیکی اور اچھائی اور خالص فکر مندی کا عنصر بھی کافی حد تک موجود ہوتا ہے۔

راولپنڈی کے کسی کالج کے بہت سے لڑکے مہاجرین کی دیکھ بھال کی غرض سے مظفر آباد آئے اور کمبل اور کپڑے محتاجوں میں تقسیم کیے اور ایک پورا دن شہر کے ہر گلی کوچے میں گھوم پھر کر میٹھی روٹیاں تقسیم کیں۔ لوگ قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور بڑی رغبت سے لڑکوں کے ہاتھ سے روٹیاں چھین کر بڑے بڑے نوالے منہ میں ڈال کر واپس آئے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو کبھی عام زندگی میں نہایت تکلف سے کام لیتے تھے اور اگر کبھی کسی دوست کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوتا تو ہمیشہ بھوک رکھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اُم نے بھی قطار میں اپنے لیے جگہ بنالی اور یہ اعلان کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں واپس آیا کہ اُس نے پانچ روٹیاں لائی ہیں۔“ اُس نے فخریہ کہا۔“ کوئی اور اتنی روٹیاں حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔“ مجھے اس بات پر غصہ آگیا اور میں نے اُم سے کہا کہ وہ دوبارہ جا کر روٹیاں واپس کرے۔ لیکن اُم کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آرہی تھی لیکن میں اُس کی لامحدود خود غرضی میں حصہ دار نہیں بننا چاہتی تھی۔ اُم نے مجھے وہی سمجھا ہوگا اس لیے وہ واپس جاتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اُس نے روٹیاں واپس کرنے کا بُرا تو نہیں منایا تھا لیکن مجھ سا گیا کیوں کہ میں نے اُس کے اس عمل کی تعریف نہیں کی جسے وہ خود ایک کارنامہ سمجھتا تھا۔ دوسری صبح میں نے اُم سے کہا کہ وہ جو دھا کو لے کر ہمارے پرانے بنگلے میں جائے۔“ جاؤ اور باغ سے کچھ سبزیاں توڑ کر لاؤ۔“ میں نے کہا۔“ یہ بھی معلوم کرو کہ وہاں کون ٹھہرا ہوا ہے اور وہ لوگ کیا کر رہے

ہیں۔“ اوم اور جودھا باغ میں گئے اور جب وہ سبزیاں توڑنے میں مصروف تھے تو انہیں بلوچ رجمنٹ کے ایک سپاہی نے دیکھ لیا۔

اُس نے اُن سے پوچھا۔ ”تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو اور کس نے تمہیں بھیجا ہے؟“  
”یہ کوٹھی پہلے ہمارے وزیر کے پاس تھی۔ اُسی کی بیوی نے ہمیں باغ سے سبزی لینے کے لیے بھیجا ہے۔“ اوم نے جواب دیا۔

سپاہی متحسّس ہو گیا۔ ”اُس کی کتنی بیٹیاں ہیں اور وہ کس عمر کی ہیں؟ وہ جانا چاہتا تھا۔  
جب اُسے معلوم ہوا کہ لڑکیاں بہت چھوٹی ہیں تو وہ مایوس ہوا۔ اور اب وہ ملازموں کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگا۔“ اب فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور باہر جا کر کھڑے رہو۔ اگر تم نے یہاں دوبارہ اپنی شکل دکھائی تو اپنی زندگی ختم سمجھو۔“ اُس نے چلا کر کہا۔

اوم اب اس قسم کی دھمکیوں کا عادی ہو چکا تھا اور اس طرح واپسی کے راستے پر چلنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن جودھا خوفزدہ ہو گیا۔ اوم کو معلوم ہوا کہ وہ چوکیدار جو پہلے اس بنگلہ پر کام کرتا تھا ابھی تک وہیں ہے اور انہوں نے آپس میں اس طرح گفتگو شروع کر دی جیسے وہ لمبی جدائی کے مارے ہوئے چچیرے بھائی ہیں۔ جودھا جس کی ماضی قریب کی یادداشت میں اتنی گپ شپ نہیں تھی، کھل کر گفتگو کرنے لگا اور سپاہی اور اُس کی دھمکیوں کو بالکل بھول گیا۔ عین اُسی وقت سپاہی واپس آیا اور اُس نے جودھا سے کہا کہ ایک آفیسر اُسے بلارہا ہے۔ جودھا کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی اور وہاں ٹھہر کر گپ شپ کرنے کے فیصلے پر افسوس کیا اور پھر فوراً اُسے آفیسر کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اوم موقع غنیمت جان کر وہاں سے کھسک گیا۔

آفیسر کو شک گزرا کہ شاید جودھا کوئی ایسی قیمتی چیز لے جانے کے لیے آیا ہے جو میں نے گھر کے کسی کونے میں چھپا رکھی ہے۔ اُس نے جودھا سے پوچھا۔ ”تم اجازت کے بغیر اس صحن میں کیوں داخل ہوئے؟ وہ آدمی جو تمہارے ساتھ آیا تھا اب کہاں ہے؟ اگر تم اس آدمی کو دریافت نہیں کرتے تو میں تمہیں گولی مروادوں گا۔“ جودھا نے اوم کو اوپر نیچے ہر طرف تلاش کیا لیکن اُسے وہ نہ ملا۔

بالآخر وہ واپس گھر آیا اور سپاہی جو اُسی کے ساتھ آیا تھا گھر میں ادھر ادھر گھومنے لگا، جیسے اُسے یہ سب کچھ عجیب اور انجانا محسوس نہیں ہوا۔ وہ بے تکلف ہو گیا اور برآمدے میں آکر آگ کے پاس بیٹھ گیا، جہاں چمن کی والدہ اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ وہ اوم کو ساتھ لیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ جودھا نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ سپاہی کے قریب بیٹھ جائے تو اُس میں شاید سپاہی کا خوف کم

ہو جائیگا۔ پھر وہ اس خوف سے بچ جائیگا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو نیوالا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ سپاہی چمن لال اور اُس کے گھر والوں پر میری غلطی کی وجہ سے سوار ہو رہا ہے۔

ایک گھنٹے تک کسی نے کوئی بات نہ کی اور ہم بیٹھے رہے۔ اُم واپس نہیں آیا۔ چمن کی ماں نے سپاہی کو واپس جانے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی اور اُس سے وعدہ کیا کہ اُم جوں ہی واپس آجائے گا وہ اُسے اُن کے پاس بھیج دے گی۔ سپاہی نہ سننے کا بہانہ کر رہا تھا اور مسلسل آگ کے اندر گھور رہا تھا۔ وہ ایسی کھلی ہوئی آنکھوں کی یکسوئی سے گھور رہا تھا جیسے دُنیا اُس کی نگاہوں کے سامنے کسی خوبصورت تصویر میں تحلیل ہو رہی ہو اور وہ اسے مسلسل اپنے ذہن میں جذب کر رہا ہو۔ ہم سب گھر کے اندر چلے گئے اور ایک چھوٹی سی کانفرنس کر ڈالی کہ کسی طرح سپاہی سے نجات حاصل کی جائے۔

چمن غصے میں تھا اور بار بار پاؤں فرش پر پکلتا تھا ”ان دو بے وقوفوں کو دیکھو۔“ وہ چلا یا۔ ”محض دو آنے کی سبزی کی خاطر انہوں نے ہمارے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی۔“ دراصل غلطی میری تھی۔ سبزی تو شخص ایک بہانہ تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے تجسس تھی کہ ہمارے پرانے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

میں سپاہی کے پاس گئی اور اُسے بتایا کہ ”میں نے ان دو ملازمین کو اپنے باغ سے سبزی چننے کے لیے بھیجا تھا۔ آخر کار وہ گھر ایک لمبے عرصے تک ہمارے پاس رہا۔ اُم یہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں گیا اور وہ کسی وقت بھی واپس آجائے گا۔ آپ یہاں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ آپ جائیں اور اپنے آفیسر کو بتائیں کہ میں اپنے ملازم کو جوں ہی وہ واپس پہنچے گا آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ یہ گھر بھی میرا نہیں ہے اور یہ لوگ اجنبیوں میں بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔“ سپاہی مخمضے میں تھا کہ وہ میری پیش کش قبول کر کے چلا جائے یا نہیں کہ اتنے میں اُم کہیں سے گھومتا گھومتا گھر کے اندر داخل ہوا۔ سپاہی نے اُم اور جو دھا کو ساتھ لیا اور ہم سب نے سکھ کا سانس لیا، تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دونوں ملازم بھی واپس آگئے۔ حملہ آوروں نے اُنہیں زیادہ پریشان نہیں کیا۔ انہوں نے ملازموں کو صرف اس قدر متنبہ کیا کہ اگر وہ دوبارہ اس بنگلے کی طرف آئے تو وہ اپنی جان کو خود خطرے میں ڈالیں گے۔ حالانکہ ایک مرحلے پر میں اُن کے بارے میں نا اُمید ہو گئی تھی۔

پڑوس ہی میں ایک گردوارہ تھا جہاں ہندو مہاجرین کے لیے ایک کیمپ لگایا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے گھر جلا دیئے گئے تھے اور اس بھری دنیا میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں تھی جسے وہ اپنی کہہ سکیں۔ وہ وہاں ریوڑ جیسے ہجوم میں رہتے تھے اور میں کبھی کبھی حیران ہوتی تھی کہ کیا اُن کی حالت ہم سے بہتر نہیں ہے۔ ہم یقیناً قدرے بہتر تھے لیکن جب آپ دکھ درد میں ہوتے ہیں تو آپ کو دوسروں سے علیحدہ کر دینا آپ کے لیے



اچھا نہیں ہوتا۔ اس طرح آپ اپنے ارد گرد کے انسانوں سے متعلق اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے کنارہ کش ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں دکھ درد عام سی بات ہو وہاں آپ اپنا خیال زیادہ نہیں رکھتے بلکہ اپنے حالات کو دوسروں کے حالات میں شامل کر لیتے ہیں اور دکھوں کے مقابلہ میں صبر اور خاموشی کی ترغیب کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے اور نہ ہی آپ چکنی مٹی میں رنگ رلیاں مناسکتے ہیں۔

اس کیمپ میں زندگی بہت مشکل تھی اور قریبی قصبوں اور گاؤں کے مسلمان اکثر وہاں آتے جاتے تھے۔ ہر روز بلا ناغہ اُن میں سے کوئی نہ کوئی اپنی پسند کی ہندو لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گا۔ یہ کسی بھی ہندو لڑکی کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ اس لیے اُن کے ہر اس اصرار اور خوفزدہ والدین نے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دور رکھنے کے لیے ایک ترکیب دریافت کی۔ انہوں نے یہ کیا کہ کیمپ کے اندر سے لڑکے تلاش کر کے اپنی لڑکیوں کی شادیاں اُن سے کر دیں۔ اس طرح موزوں اور مناسب جوڑے تو نہیں بن سکتے تھے لیکن اس سے دلہنوں کی تلاش میں سرگرداں مسلمانوں کا آنا بند ہو گیا۔ اگرچہ شیوا دیال نے اپنے آپ کو کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا کہ اُس نے ایک نوجوان بیوہ کو اپنی زوجہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اُس کے رویے سے یوں لگتا تھا جیسے اُس نے اجتماعی مقصد کے لیے یہ نقصان اٹھایا ہو۔ اُس نے شادی کے وقت اعلان کیا ”اگر اس بیوہ سے میری شادی اس کو ان بد معاشوں سے بچا سکتی ہے تو مجھے کوئی افسوس نہیں۔“

کیمپ میں ایک خاتون ایسی بھی تھی جس کا شوہر گم ہو چکا تھا اور اُس کے ساتھ ایک بچہ تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہتی تھی جن کے پاس اُس کو اور اُس کے بچے کو کھلانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اُسے ایک مسلمان کے حوالے کر کے اُس سے کچھ غلہ حاصل کر لیا جائے۔ لیکن وہ بالکل بضد تھی کہ وہ اُس سے شادی نہیں کرے گی۔ وہ امداد کے لیے میرے پاس آئی۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر بالکل واضح تھی۔ میں نے اُس کو نصیحت کی کہ وہ اپنی بات پر ڈٹی رہے اور میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں روزانہ اُسے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دے دیا کروں گی۔ ہمارے پاس بھی زیادہ فالتو راشن نہیں ہوتا تھا اگرچہ تھوڑے سے فالتو راشن کی منظوری بھی حاصل تھی۔ لیکن وہ اسی پر بہت خوش تھی کہ اُسے کسی کے تعاقب کی اذیت سے نجات ملی ہے۔

صبح کے تقریباً چار بجے تھے جب میں نیند سے جاگ اُٹھی اور مجھے گھر کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازے پر دو تین گھونسوں کی تھپتھاہٹ کی آواز آرہی تھی۔ ”ہم چار لوگوں نے اکٹھے ہو کر ایک گروپ بنایا اور صبح سویرے کے ملاقاتی کا استقبال کرنے کی تیاری کی جس کے لیے دروازے کے سامنے والے کوریڈور میں دیوار کے ساتھ منسلک مٹی کا دیا جلایا۔ جوں ہی دروازہ کھلا سپاہیوں کی ایک قطار اندر داخل ہو گئی۔ اُن میں سب

سے آگے بریگیڈیئر کے رینک کا ایک آفیسر تھا۔ میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی لیکن دیئے کی ٹٹماتی ہوئی لو میں اُس کی وردی کا لشکارا بے حد نمایاں تھا۔ پھر میں نے وردیوں کا ایک ہجوم سادیکھا جن کے اُوپر سر ہی سر تھے جو تاریکی کی وسعتوں میں ہر قسم کی تفصیل اور شناخت سے خالی تھے۔ اس منظر کے فوری تاثرات سحر انگیز تھے۔ کئی ہفتوں سے ہم ایک کنارے پر کھڑے تھے اور زندگی کے آخری دن گن رہے تھے۔ اس پس منظر میں صبح چار بجے پاکستانیوں کی آمد کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ہم سب آخری دعائیں کرنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

میں نے بریگیڈیئر سے کہا۔ ”آپ ایک ہی دفعہ ہمیشہ کے لیے ہمارا قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟ ہمارے لیے زیادہ انتظار کوئی خوشگوار صورت حال نہیں ہے۔“

بریگیڈیئر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور جواب دیا۔ ”ہم یہاں آپ کو مدد کی پیشکش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے لیے راولپنڈی منتقل ہو جانا بہتر رہے گا۔ ہم آپ کے سفر اور وہاں ٹھہرنے کا انتظام کر دیں گے۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ میں چونکہ آپ کی قیدی ہوں اس لیے مجھے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔“ اُن میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ ہندوستان جانا چاہیں گی؟“

”ابھی نہیں۔ مجھے کچھ وقت کے لیے یہاں ٹھہرنا چاہیے۔“

بریگیڈیئر نے کہا۔ ”ہم نے کچھ بسیں کرائے پر حاصل کی ہیں جو آپ سب کو وہاں پہنچا دیں گی۔ لیکن لگتا ہے کہ آپ کسی پر اعتماد نہیں کرتیں۔“ اس کے بعد وہ سب وہاں سے چلے گئے۔



## الوداع مظفر آباد!

مظفر آباد کا سارا قصبہ جموں کے چوہدری عبدالحمید ☆ کو خوش آمدید کہنے کے لیے سرگرم تھا جواب پاکستان میں چلے آئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں سے بھی کہا گیا تھا کہ وہ چوہدری صاحب کا خطاب سننے کے لیے آئیں۔ ہم نے بمشکل ابھی دوپہر کا کھانا ختم کیا تھا کہ چوہدری صاحب اور کچھ دیگر آفیسر مجھے ملنے کے لیے آگئے۔ اُن میں ایک وادی لداخ کا کچر و احمد شاہ بھی تھا جو ریاست کی حکومت میں مال آفسر ہوا کرتا تھا۔ جب قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا تو اُس نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اب وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں مال آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ دُرّانی بھی اُن کے ساتھ تھا۔ معمول کی علیک سلیک کے بعد چوہدری صاحب نے میرے شوہر کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا۔

میں نے اُن لوگوں کو ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا جو میرے ساتھ تعزیت کرنے آتے تھے۔ اس لیے میں نے اُنہیں چُپ کر دیا۔ ”آپ کیوں افسوس کر رہے ہیں؟ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے مبارکباد دی جانی چاہیے کیونکہ بہت کم خواتین ایسی خوش نصیب ہوں گی جن کے شوہر میرے شوہر کی طرح ہوئے ہوں گے۔“ اُنہوں نے کہا۔ ”اگر مہتا صاحب نے مجھے جموں جانے کی اجازت دی ہوتی تو میرے بچے بھی آج زندہ ہوتے۔“

”میں اس سب کے لیے جو ہو چکا ہے افسوس کرتی ہوں۔ لیکن کیا آپ میرے شوہر کے ساتھ ناانصافی نہیں کر رہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ وہ محض حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔“ انہوں نے پیشکش کی کہ وہ میری مدد کریں گے۔ ”میں آپ کو اور آپ کے بچوں کو جموں بارڈر پر لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بدلے میں اپنے کچھ لوگوں کو جو وہاں رُکے ہوئے ہیں واپس لاؤں گا۔“

دڑانی نے اصرار کیا کہ مجھے اس تجویز سے متفق ہونا چاہیے اور اُسی نے میرے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوں لیکن مسز مودی، اُس کی بیٹی کلا اور اپنے ملازموں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ چوہدری صاحب نے کہا۔ ”میرے لیے اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو لے جانا ممکن نہیں۔“

”پھر مجھے خدشہ ہے کہ ہم سب کو یہیں رہنا پڑے گا۔ میں ان کو اس بیچارگی کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

انہوں نے اس نکتہ پر تفصیلی بحث کی اور اس قدر تھک گئے کہ مزید دلیل بازی نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر انہوں نے اتفاق کر لیا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان باندھ لیا اور لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد دڑانی ہمیں لینے کے لیے آگیا۔ ہم کُل ملا کر گیارہ نفوس بنتے تھے۔ میرے پانچ بچے، سویڈش، کلا، مسز مودی، دو ملازمین، اور میں خود۔ جب چمن کے گھر سے ہمیں الوداع کہا جانے لگا تو سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسوں تھے۔ میں جانتی تھی کہ وہ سب ہمیں بہت یاد کریں گے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے اور اب انہیں اس طوفان کا تنہا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ ہم نیچے سڑک پر اترے جہاں بس ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ مولوی کو بھی خبر ہو گئی تھی کہ ہم جا رہے ہیں اس لیے وہ بھی ہمیں الوداع کرنے کے لیے آگیا تھا۔

جلد ہی ہم مظفر آباد سے نکل گئے۔ ہم نے بس کے ڈرائیور کو پہچان لیا۔ میں نے کئی مرتبہ اسی بس میں سری نگر سے مظفر آباد کا سفر کیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے پوچھا کہ کیا اُسے یاد ہے کہ آج سے دو ماہ پہلے وہ مجھے سری نگر سے مظفر آباد لایا تھا؟ لیکن اُس کا ردیہ انتہائی غیر دوستانہ تھا اور وہ گفتگو شروع کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اُس نے خشک لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ ہندوستان جا رہی ہیں؟ ہندوستانی فوج چپک کے مرض میں مبتلا ہے اور تم جلد دیکھ لو گی کہ اُن کے ساتھ کیا حشر ہوتا ہے۔“

ہر پل پر بس کو روکا جاتا اور سنتری معمول کی پوچھ گچھ کرتا۔ بس کہاں جا رہی ہے اور مسافر کون ہیں وغیرہ۔ جب انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ بس پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے آرہی ہے تو تب ہی وہ اُسے آگے جانے دیتے تھے۔ ہمارے ساتھ سفر کرنے والوں میں کچھ کشمیری مسلمان بھی تھے جو ہمارے بچوں کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ جب ہم پاکستان کے علاقے گڑھی حبیب اللہ پہنچے تو ایک بڑا مجمع چوہدری صاحب کو سننے کے لیے وہاں موجود تھا۔

ہم نے بس میں ہی بیٹھ کر اُن کے آنے کا انتظار کیا اور دڑانی نے مجھے کیا۔ ”اگر کوئی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ آپ کون ہیں اور کہاں جا رہی ہیں تو مہربانی کر کے کچھ بھی نہ بتائیں۔ اُسے میرے ساتھ بات

کرنے دیں۔ لیکن اگر آپ کچھ کہنا ضروری سمجھیں تو اُسے بتائیں کہ آپ میری بہن ہیں اور میرے گھر جا رہی ہیں۔“

گڑھی حبیب اللہ سے لے کر ایبٹ آباد تک راستے میں ہمیں بے شمار قبائلی ملے جو گزرتی ہوئی بس میں ہمیں دیکھ کر گھورتے تھے۔ ایبٹ آباد کے ڈاک بنگلے میں ہمیں کمرہ نہیں مل سکا کیوں کہ وہ سارا علاقہ قبائلیوں سے اُٹا پڑا تھا۔ بالآخر ہمیں شہر کے ایک ہوٹل پر لے جایا گیا۔ ہمارے لئے ایک کمرہ بک ہوا اور درزانی نے کھانے کا آرڈر دیا۔ ہم سب اُس رات بڑے مزے سے سوئے اور دوسرا دن بھی ہوٹل ہی میں گزارا۔ دن کے وقت چوہدری صاحب بہت مصروف رہے اور شام کو جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہمیں راولپنڈی روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جانے کو کہا۔

راستے میں درزانی نے ڈرائیور کو کہا کہ وہ ایک گھر کے سامنے رُکے۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ اُس کے رشتہ دار یہاں رہتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنا کچھ سامان اُن کے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ اُس نے ہمیں کہا۔ ”کیا آپ نیچے اُتر کر میرے رشتہ داروں سے ملنا پسند کریں گے؟“ اُن میں سے ایک ریاست جموں کشمیر میں کرنل رہ چکا تھا اور اُسے بچ کر یہاں آنے سے پہلے جموں میں بہت بُرے دن دیکھنے پڑے تھے۔

ہم سب گھر کے اندر چلے گئے۔ ایک بوڑھا آدمی چار پائی پر بیٹھ کر حقہ پی رہا تھا اور اُس کے قریب ہی دو بوڑھی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ایک وردی پوش نوجوان اُوپر نیچے چکر لگا رہا تھا۔ ہم قالین پر بیٹھ گئے اور درزانی نے ہمارا تعارف کروایا۔ بوڑھی خواتین جاننا چاہتی تھیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم راولپنڈی جا رہے ہیں۔ دونوں خواتین ایک دوسری کی طرف دیکھتے ہوئے لمبی چوڑی واقفیت کا احساس دلا رہی تھیں۔ بوڑھے کرنل نے کہا۔ ”قبائلی لڑکوں کو نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ اُن خواتین کے اندرونی خوف کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اُس نے مزید کہا۔ ”پانچ ہزار مسلمان جموں میں داخل ہو چکے ہیں اور یقینی طور پر وہ جموں کو ہندوؤں سے چھین لیں گے اور ہندو بھی اُسی طرح نقصان اٹھائیں گے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرا ایک بیٹا اب بھی گم ہے؟“ بیٹے کی یاد نے اُس کی آنکھوں میں آنسوں بھر دیئے۔

خواتین صرف ہنس دیں۔ مصائب اور دکھوں نے انہیں اتنا سنگ دل بنا دیا تھا کہ اب وہ اُن کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ تاہم اُن کے ہنسنے کا انداز کسی حد تک بے اسرار اور مصنوعی تھا۔ بچے سہمے ہوئے تھے اور ہم گھر سے نکل آئے۔ بوڑھی خواتین نے قبائلیوں کے ہاتھوں بچوں کو قتل کرنے کے بارے جو کچھ کہا تھا راولپنڈی پہنچنے تک



مسلل میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ ہم ایک کیمپ میں رُکے جو کشمیری مسلمانوں کے لیے لگایا گیا تھا۔ وہ ہندوستان سے وہاں آئے تھے۔ ہمیں اُس کیمپ میں ایک دو دن ٹھہرنے کے لیے کہا گیا کہ اُس کے بعد ہمیں مسلمانوں کے ساتھ تبادلہ کے لیے جموں کی سرحد پر لے جایا جائے گا۔ ہم اُس کیمپ میں داخل ہوئے جو ڈی۔ اے۔ وی کالج میں قائم کیا گیا تھا جہاں ہمیں ایک کمرہ دیا گیا۔

دڑانی اور چوہدری صاحب یہ وعدہ کر کے کہ وہ اگلے روز واپس آئیں گے، وہاں سے چلے گئے۔ ہم ماحول کی اجنبیت کے باعث قدرے خوفزدہ تھے۔ کیمپ کے کشمیری ہمیں بے تکلف کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہمارے بچوں کے ساتھ مخلصانہ شفقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایک آدمی ہمارے کمرے میں آیا اور کہا۔ ”میں ہندو ہوں اور مسٹر مہتا میرے دوست تھے۔ میرا ایک مسلمان دوست اور میں اس کیمپ کے انچارج ہیں۔ ہم آپ کا راشن آپ کو بھیج دیں گے۔ اُس نے کچھ کھانا بچوں کے لیے اور پھل مسز مودی اور میرے لیے بھیجے۔ اس سب کے باوجود کہ جو کچھ اُس نے کہا میں اس بات پر قائل نہیں تھی کہ اُس نے سچ بولا ہے۔ میں اس آدمی کو یاد کرنے کے لیے اپنی یادداشت پر زور دیتے دیتے سو گئی۔ مجھے احساس تھا کہ میں اس آدمی کو اس سے پہلے کبھی نہیں ملی۔



## کشمیری مسلمان

جب میں بیدار ہوئی تو سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک سنتری تھا جو کندھے پر راقل رکھ کر ہمارے کمرے کی طرف آنے والے راستے میں اوپر نیچے چکر لگا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا لیکن میں صرف اُس کا تاریک سا ہیولا ہی دیکھ سکی جو میا لے آسمان کی مخالف سمت میں کھڑا تھا۔ اُس کے بھاری کیلوں والے جوتے پتھر کے فرش سے ٹکرا کر ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جس میں یکسانیت کی باقاعدگی تھی اور جو وقفوں وقفوں سے مجھے نیند کی آغوش میں دھکیل دیتے تھے۔ میں دوبارہ جاگی اور دیکھا کہ وہ وقتی طور پر نظر سے اوجھل ہے لیکن پھر اچانک ایڑیوں کے بل چل کر اُس کے واپس آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ معمول کے وقفوں سے لیکن بالکل بے مقصد ارادے سے چلتا جاتا تھا۔ ابھی تک سورج مشرق کی جانب بہت نیچے تھا لیکن اُس کی شعاعیں صبح کے تازہ آسمان پر سُرخ ٹکڑوں کی شکل میں سہرے کی طرح نہ جانے کس کے ساتھ لٹکی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کئی ہفتوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں صبح سویرے اتنی دیر تک بستر پر پہلو بدلتی رہی اور نیند کے بعد کی تازگی سے محظوظ ہوتی رہی۔ میں اب پہلے کی طرح کسی خطرناک کنارے پر نہیں تھی اور مستقبل جو بالکل ساکت اور جامد ہو چکا تھا اور حال کا حصہ بن کر اب دوبارہ کسی حد تک متحرک ہو رہا تھا۔ یہ صورت حال کسی بست رو اور جگالی پسند جانور، جو معمولی سی تبدیلی اور حرکت کے آثار کے نتیجے ہی میں گہری نیند سے اٹھنے کی تیاری کرنے لگتا ہے، سے ملتی جلتی تھی۔ ماضی میری یادداشت سے بیدخل ہو رہا تھا۔ میں عجیب سی سرخوشی کا احساس لیے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور حیران تھی کہ کیا یہ واقعی اس وجہ سے ہے کہ میں آنے والے دن کا خوشی سے انتظار کر رہی ہوں۔

ہمیں خاصی مقدار میں دودھ، گھی اور باقی راشن بھیجا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ کئی کشمیری مسلمان اسی کیمپ میں ہیں اور اُن میں سے کئی تو ہمیں ملنے کے لیے بھی آئے۔ انہوں نے کہا: ”ہم بھی جہنم سے گزر کر آئے ہیں اور آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوش ہیں۔ ہمارا دل اپنے ملک کے لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔“ لیکن انہوں نے اپنی مشکلات کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے والے

ایک دوسرے کے ساتھ اپنے مسائل کا ذکر کم ہی کرتے ہیں۔ شاید یہ مصائب کا بپتسمہ (Baptism) تھا جس نے انہیں تصوف کی طرف مائل کر دیا تھا جس میں خاموشی ہی کے ذریعے حصہ لیا جاتا ہے۔ یہ اتنا نازک اور متبرک معاملہ تھا کہ اسے کسی جاہلانہ گفتگو کے ذریعے ایک دوسرے پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کیمپ میں دو مسلمان لڑکے ایسے بھی تھے جو میری پیدائش کی جگہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ وہ میرے باپ کے گھر سے بالکل قریب ہی رہتے تھے۔ میں نے فوراً انہیں پہچان لیا اور انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟“ وہ جموں کے کسی کالج میں تھے اور انہیں فرقہ وارانہ فسادات کے خوف سے وہ جگہ چھوڑنی پڑی تھی۔

”لیکن ہمارے آبائی ضلع میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ اور مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم بھی یہی امید رکھتے ہیں۔ کشواڑ میں ہمیں کبھی فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اب بھی وہاں کے لوگ فسادات شروع نہیں کریں گے۔“

سیاست جب اس قسم کے سادہ لوح لوگوں کے ردیوں کو عموماً کی طرف لے جاتی ہے تو وہ بالکل مصنوعی اور غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ ان کا آبائی علاقہ، اس کا ماحول اور اس کے لوگ ان چند روایات کا حصہ تھے جن کو یہ لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی اہمیت سمجھتے تھے اور اولین ترجیح کے طور پر وہ انہی چیزوں سے محبت کرتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ حقیقت میں یہی وہ واحد سماجی تصور تھا جو ان کے ذہن میں احساسات کی قربت پیدا کرتا تھا۔ ہر شخص اکثر سنتا تھا اور پڑھتا تھا کہ فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ اور لوگ بلا ناغہ ان موضوعات پر گفتگو کرتے تھے جیسے کہ یہ دونوں سماجی اور انفرادی خصوصیات ہوں۔ لیکن یہ ہندو اور مسلم جنہیں سیاستدانوں نے قیاس آرائیوں کی طرف مائل کیا اور سمجھایا، چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے تھے، جہاں یہ مقامی اور ہم وطن لوگ نسل در نسل اجتماعی ذہنیت اور دوستیوں کو مشترکہ مفادات کے ذریعے برقرار رکھے ہوئے، اپنی اپنی کیونٹی کو سماجی اور جذباتی لحاظ سے خود کفیل بنائے رکھتے ہیں۔ انہیں شاید کبھی ایسا کوئی حکم یا فرمان کہیں سے نہیں ملا جس کی وجہ سے وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ محبت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ جذبہ انہیں فطرت نے عطا کیا ہے۔ معمول کے اداروں کے علاوہ مذہب ان کے لیے محض تجریدی (Abstraction) حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی چیز جو شعوری سطح پر نہیں دیکھی جاسکتی حقیقی نہیں ہو سکتی۔ یہ کچھ اس طرح تھا کہ انہیں کسی نظریے کو قبول کرنے سے پہلے اسے جسمانی طور پر محسوس کرنا تھا۔ لیکن

سیاست دانوں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے سچائی کو نئے انداز میں پیش کرنے کے دوران اُسے مسخ کر دیا۔ اُس نے (مسلمان لیڈر) متنبہ کیا۔ ”اسلام خطرے میں ہے۔ آپ کی مسجد، آپ کی نماز، بلکہ آپ کے بچے اور آپ کی جائیدادیں بھی تباہی و بربادی سے دوچار ہونے والی ہیں۔“ اُس کی منطق واضح اور قابل فہم نہیں تھی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کس طرح یہ باتیں ایک دوسرے تک پہنچیں اور بالآخر وہ اُسی راستے پر چل پڑا۔ سماجی الٹ پلٹ جو وہ چاہتا تھا اُس نے حاصل کر لیا۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس کی بھاری قیمت ادا کی بہت کم محسوس کر سکے (انہیں محض شک کا معمولی سا شائبہ محسوس ہوا) کہ اسلام کو کبھی کوئی خطرہ نہیں تھا بلکہ یہ خطرہ تخلیق کیا گیا تھا۔

میں نے لڑکوں سے پوچھا۔ ”تم یہاں کہاں رہتے ہو اور کس کے ساتھ رہتے ہو؟“  
 ”ہم اسی کیمپ میں رہتے ہیں۔ یہ مسلمان مہاجرین کو فائدہ پہنچانے کے لیے کھولا گیا ہے۔ اب اس میں تقریباً تین سو کے قریب مسلمان رہتے ہیں۔ جموں سے صرف ہم ہی آئے ہیں۔ یہ کیمپ مسٹر ریڈی اور اُس کے ایک مسلمان دوست چلا رہے ہیں۔ ہر صبح ہم ڈرل کرتے ہیں اور پھر ہمیں راکفل چلانا سکھایا جاتا ہے۔ پاکستانی فوج کے کچھ کشمیری مسلمان اس ٹریننگ کے انچارج ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں اس کیمپ سے متعلق بہت خوش ہوں۔ یہ مجھے بیتے ہوئے اچھے دنوں کی یاد دلا رہا ہے۔ یہاں لوگ اپنے اپنے مذہب کے بارے زیادہ حساس نہیں ہیں۔“  
 ”ہم یہ سارا کریڈٹ مسٹر ریڈی کو دیتے ہیں۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔“  
 ”مسٹر ریڈی کون ہے؟ مجھ یا اُس کے بارے مزید کچھ بتاؤ۔“ میں نے اُن سے پوچھا۔

”وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ کشمیر کی حکومت نے اُس کے اخبار پر پابندی لگادی تھی اور ریاست سے نکال دیا تھا۔ دونوں ہندو اور مسلمان اُس کی حقیقی معنوں میں عزت کرتے ہیں۔“ مجھے اچانک وہ شخص یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ اُسے راولپنڈی جاتے ہوئے مظفر آباد میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کرنل اُس کے خلاف سخت کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے شوہر نے اُس کا ہاتھ روک لیا تھا۔

اُس کے بعد مسٹر ریڈی بھی مجھے ملنے کے لیے آیا۔ ویمل اور سریش اُس کے ساتھ ذرا باہر (Outing) نکل گئے۔ وہ بالکل پاگل ہوئے جا رہے تھے جب یہ اعلان کرنے کے لیے دوڑے کہ مسٹر ریڈی پہنچ رہا ہے۔ مسٹر ریڈی نے اُن دونوں کو جوتے خرید کر دیئے اور سریش کو ایک جرسی (Pullover) بھی۔ اس تمام عرصے میں اُس نے صرف ایک قمیض پہن کر گزارا کیا تھا۔ مسٹر ریڈی لڑکوں کو چائے پلانے کے لیے بھی لے

گیا اور انہیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ لڑکے ذرا گھبرائے ہوئے تھے کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ شاید اجنبیوں سے تحفے لینے کے معاملے میں میری منظوری حاصل نہ ہو۔ میں نے مسٹر ریڈی کا شکریہ ادا کیا اور اُسے بتایا۔ ”آپ کو یہ چیزیں ہمارے لیے نہیں خریدنا چاہئیں تھیں۔ میرے لیے یہ سب کچھ قبول کرنا مشکل ہے۔“

”براہ مہربانی تکلف نہ کریں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”آخر کار مسٹر مہتا میرا بہت اچھا دوست تھا۔ علاوہ ازیں ان لڑکوں کے پاؤں کی بُری حالت تھی۔ مجھے آپ کے تکلیف دہ تجربات کا علم ہو چکا ہے۔ یہ سُن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ کیا میں آپ کو اپنے گھر میں منتقل ہونے کا مشورہ دے سکتا ہوں؟ ابھی ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے لیے آپ کو جوں بھیجنا کب ممکن ہوگا۔ اس دوران میں آپ کو یہاں رہنے کی نصیحت نہیں کر سکتا۔“ مسٹر ریڈی کچھ وقت کے لیے ہمارے پاس رہا۔ میں نے مسز مودی سے مشورہ کیا۔ پہلے تو مسز مودی نے ایک اجنبی کے ساتھ رہنے کے خیال کو پسند نہیں کیا لیکن بعد میں، میں نے اُسے قائل کر لیا۔

مجھے اُس بات کا کوئی زیادہ افسوس نہیں تھا کہ ہمیں فوری طور پر جوں کیوں نہیں لے جایا جا رہا۔ میں یہاں ان کشمیریوں کے پاس بہت خوش تھی اور یہاں جو بھی مسلمان تھے وہ دوسروں کے مقابلے میں خوش گوار تضاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے حملہ آوروں کے بارے بے شمار خبریں سنیں کہ وہ ریاست میں کیسے داخل ہو گئے اور ہندوستانی فوج نے عین وقت پر اُن سے سری نگر کیسے چھین لیا۔ اُن میں سے اکثر نے زیادہ حملہ آور نہیں دیکھے تھے۔ اُن کے پاس زنا بالجبر اور گھبراؤ جلاؤ کی خبریں زیادہ تو سُنی سنائی تھیں۔ کچھ مسلمانوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مظفر آباد میں اُن کے رشتہ داروں کے بارے کچھ جانتی ہوں؟ میں نے اُن سے کہا۔ ”آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ وہاں کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کو بھی معاف نہیں کر رہے۔ بلکہ اُن میں سے اکثر کو قوم پرست تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے۔“

پہلی مرتبہ ان لوگوں کو محسوس ہوا کہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے شیخ عبداللہ کے بارے بھی پوچھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ مل کر حملہ آوروں کے خلاف لڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک منصف مزاج ذہن کا مالک ہے جو فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر ہے۔“

میں نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ میں نے اس مفروضے کو بنیاد بنایا تھا کہ اُن میں سے اکثر نے حملہ آوروں کی حکومت سے دھوکہ کھایا تھا۔ وہ میرے کانوں میں اعتماد کی بنیاد پر کچھ کہنے سے پہلے خفیہ طور پر ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے۔ ”ہمیں بھی کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑنی چاہیے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ کتنی مشکل ہے اور کیسے ہوگا۔“



مسٹر ریڈی ہمیں پونچھ ہاؤس منتقل کرنے کے لیے بس لے کر آ گیا۔ اس پر ”آزاد کشمیر“ کے الفاظ نمایاں طور پر درج تھے اور اس کے اندر ایک وردی پوش امریکی سپاہی بیٹھا ہوا تھا جس کے سر پر خاکی پگڑی تھی جو بھڑی لگ رہی تھی۔ پونچھ ہاؤس بہت وسیع تھا اور اس میں ہنگامی انتظامیہ کام کر رہی تھی۔ وہاں کئی لاریاں اور موٹر سائیکل تیاری حالت میں رکھے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ ایک ہی کمرے میں ٹھونے ہوئے تھے اور کئی بڑے لیمپوں کی روشنی میں کام کرنے میں مصروف تھے۔ ایک امریکن بریگیڈیئر اور ایک معزز مسلمان اسی گھر میں مسٹر ریڈی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ یہاں زندگی کافی آرام دہ تھی اور ہم نے بہت اچھی طرح گرم پانی سے غسل کیا۔ ان تین ماہ میں مجھے اچھے صابن کی خوشبو بھول چکی تھی۔ یہ بڑا صحت مند تجربہ تھا۔ ہمارے کھانے کے لیے بھی تین ڈشیں تھیں۔ ہم آگ کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنے صاف ستھرے ہاتھوں کو گرم کیا۔ کافی عرصہ سے مجھے اس طرح کی خالص اور سادہ خوشیاں نصیب نہیں ہو سکی تھیں۔ ہم اپنی کرسیوں ہی پر سو گئے۔ دوسری صبح کئی کشمیری مسلمان جو وہاں کام کرتے تھے (میرے شوہر کو جانتے تھے) ہمیں ملنے کے لیے آئے اور اُن میں سے کچھ بچوں کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی لے کر آئے۔ درّانی اور امریکن بریگیڈیئر بھی آئے۔ اُنہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اب ایک یا دو دن میں اُن کے لیے جموں کی روانگی ممکن ہو سکے گی۔

شام تک مجھے ایک اور اہم ملاقاتی سے واسطہ پڑا۔ یہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کا وزیر دفاع علی احمد شاہ تھا۔ وہ میرے شوہر کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس وقت پرانی یادوں کو کریدنے کے موڈ میں تھا۔ اُس نے اُن دنوں کا ذکر کیا جب وہ دونوں اکٹھے تھے اور کشمیر پر آنے والے بُرے دنوں پر افسوس کا اظہار کیا۔ ”ہم نے یقیناً اچھے دن دیکھے ہوئے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ بظاہر وہ اپنے قول میں مخلص تھا کیوں کہ وہ تقریباً بھول چکا تھا کہ ان بُرے دنوں کی ذمہ داری اُس پر بھی اتنی ہی عائد ہوتی تھی جتنی کسی اور پر۔ بلا واسطہ (Indirectly) ہی سہی۔

مسٹر ریڈی بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اُن دونوں کو بتایا کہ مجھے اُن سے مدد چاہیے۔ مظفر آباد میں میرے کچھ دوست ہیں جن کے ساتھ میں وعدہ کر کے آئی ہوں کہ جوں ہی میں کسی ٹھکانے پر پہنچوں گی تو انہیں یہاں سے نکلوانے کے لیے پوری کوشش کروں گی۔ مسٹر ریڈی فوراً رضامند ہو گیا اور اُس نے اُن لوگوں کے نام اور پتے لکھ لیے۔ اُس نے کہا۔ وہ اُنہیں بھی محفوظ مقام پر منتقل کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش کرے گا۔ لیکن مسٹر ریڈی نے مجھے یاد دلایا کہ میں بحفاظت ہندوستان پہنچ جانے کے بعد یہ لڑائی ختم نہیں کروں گی۔ میں اُن لوگوں سے جنہیں پیچھے چھوڑ کر جا رہی تھی، زیادہ خوش نصیب ہوں اس لیے اُن کا مجھ پر قرض ہے کہ میں اُن کے لیے کام کروں۔ میرپور میں قائم علی بیک کیمپ کسمپری کی حالت میں تھا اور اُسے کافی مالی مدد کی ضرورت تھی تاکہ

اُسے چلایا جاسکے تو کیا میں کوشش کروں اور ہندوستان سے فنڈ جمع کر کے مسٹر ریڈی کو بھیجوں؟ میں نے وعدہ کیا کہ مجھے آسانی سے باہر نکلنے کا راستہ مل رہا ہے اس لیے میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کروں گی۔

ہر شخص نے اس معاملے کو طے شدہ سمجھ لیا تھا، جس میں میں بھی شامل تھی کہ ہم چند دنوں میں ہندوستان پہنچ رہے ہیں۔ امریکن بریگیڈئیر کوئی یادگار مانگ رہا تھا کیوں کہ اُس کے پاس کیمرہ تھا جس سے اُس نے ہمارے گروپ کی ایک تصویر لی۔ اُس کے بیرے نے میرے بچوں کا اس قدر محبت و شفقت سے خیال رکھا کہ اُن کا تھوڑا سا وزن بھی بڑھ گیا اور اُن کے زرد گالوں پر سُرخ آگئی۔



## دوبارہ جیل میں

پونچھ ہاؤس میں ہمیں بالکل کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں اس بارے فکر مند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ جموں بارڈر اور اُس سے آگے ہمیں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ درّانی چھ دنوں کے بعد ہمیں ملنے کے لیے آیا اور مجھے یقین دلایا کہ اگلی صبح اسے جموں کے لیے روانہ ہونے کا پورا یقین ہے۔ مسٹر ریڈی اور بریگیڈئیر بہت مصروف تھے اور ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے تھے لیکن اُن کے اور درّانی کے علاوہ آٹھ اور کشمیری ہمارے گروپ میں سفر کرنے والے تھے۔

جہلم کے پُل تک کا سفر لمبا اور غیر دلچسپ قسم کا تھا۔ جوں ہی ہماری بس متروک سڑک پر اُتری تو میں نے باہر کی دُنیا کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا جسے ہم کسی افسوس کے بغیر تیزی سے پیچھے چھوڑ رہے تھے۔ سخت سردی کے باوجود ہمارے سامنے سبزہ پھیلا ہوا تھا لیکن میرے لیے کسی کشش کا باعث نہیں تھا۔ میرا ذہن جو جسمانی اذیتوں کا مارا ہوا تھا، بیمار تھا اور مزید بیمار ہونا چاہتا تھا۔

جوں ہی ہم راولپنڈی کے باہر والے مضافات میں پہنچے تو بس کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ بلکہ بس کے رُکنے سے پہلے ہی ہمیں قبائلیوں کے ایک ہجوم نے گھیر لیا۔ وہ کے ارد گرد جمع ہو گئے جو انہیں واپس پیچھے کی طرف دھکیلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُن میں سے کچھ تو دوڑ کر بس کی چھت پر سوار ہو گئے اور زوردار مطالبہ کرنے لگے کہ انہیں اگلے مورچوں پر پہنچایا جائے۔ وہ وہاں جم کر بیٹھ گئے، ایسے مسافروں کی طرح جن کی آنکھوں میں سچائی کی چمک اور بس سٹاپ پر طویل انتظار کا غصہ ہو۔

درّانی نے وضاحت کرنے کی بہت کوشش کی کہ بس پہلے ہی بھری ہوئی ہے اور یہ کہ وہ کسی بھی صورت اگلے مورچوں پر نہیں جاسکتا۔ اُن میں سے ایک نے رائفل نکال لی اور کہا۔ ”اگر آپ ہمیں پیچھے چھوڑ کر جائیں گے تو آپ ان مسافروں کی جگہ لاشیں لے کر جائیں گے۔“ اور اس بھونڈے مذاق پر وہ خود ہی خوش ہونے لگا۔ ہجوم بڑھتا گیا اور دوسروں کی طرح وہ بھی بحث و دلیل کے انجام کا انتظار کرنے لگا۔ قریب کھڑے

تماثائی لاطلق ہو کر ایک مخصوص خط محسوس کرتے رہے حالانکہ اُن کا رویہ تشددانہ حد تک جانبداری کا تھا۔ لیکن جہوم کا حصہ ہونے کی وجہ سے اُن کی دلچسپی حیرت انگیز حد تک غیر جانبدارانہ تھی۔ اُن کے نزدیک فاتح کی نیکی (خوبی) اخلاقی لحاظ سے بالکل بے معنی تھی۔

جوں ہی ایک پولیس آفیسر وہاں پہنچا تو اچانک خاموشی چھا گئی۔ اُس نے دڑانی کو بلایا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ دڑانی کو یقین تھا کہ نمایاں الفاظ میں تحریر ”آزاد کشمیر“ کا بورڈ کام کر جائے گا۔ ”میرا خیال تھا کہ یہ واقعی پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کی بس ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہم اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو جموں بارڈر پر لے جا رہے ہیں۔“

”مجھے خدشہ ہے کہ آپ کمشنر کی تحریری اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔“

دڑانی کا خیال تھا کہ وہ پولیس آفیسر خواہ مخواہ ٹانگ اڑا کر معاملہ خراب کر رہا ہے اور کہا ”ہم یہاں نہیں رُکنا چاہتے۔ ہمیں کسی کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کئی ماہ سے ”پاکستانی مقبوضہ کشمیر“ کی حکومت کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

لیکن آفیسر نے اصرار کیا کہ حال ہی میں تازہ احکامات جاری ہوئے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو دفتر میں جا کر تصدیق حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم سب مل کر دفتر کی طرف گئے اور ہمارے ایک آدمی نے نیچے اتر کر نئے احکامات کے بارے دریافت کیا۔ میں نے اُسے تارک اور مایوس کن تیوری کے ساتھ واپس آتے ہوئے دیکھا۔ لہذا میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ جموں اگر ہے بھی تو ہمارے لیے ابھی نہیں ہے۔

وہ بس میں سوار ہوا اور کہا۔ ”یہ بڑے مشکل لوگ ہیں اور بہت شکی ہیں۔ وقتی طور پر ہمیں واپس راولپنڈی جانا ہوگا۔ اگر ہمیں کمشنر سے اجازت نامہ مل بھی جائے تو ہمیں کل تک بارڈر پر پہنچنے کے لیے مقد ر کی یادوری چاہیے۔“ میں جانتی تھی کہ یہ پہلے سے بھی بُرا ہوا۔ حوصلہ مند آواز میرے حق میں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باقی سارے لوگ مایوس ہوں۔ دڑانی ہمارے ساتھ واپس نہیں آیا لیکن اُس نے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے دن آجائے گا۔ ہم بس لے کر سیدھے کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ ہم میں سے ایک آدمی کمشنر کے کمرے میں گیا اور جب واپس آیا تو وہ اپنی مقامی زبان میں روانی سے قسمیں کھا رہا تھا۔ ”یہ لوگ ہمیں چوروں کا گروہ سمجھ کر سلوک کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے اتنا کچھ کیا ہے لیکن پھر بھی وہ ہم پر اعتماد نہیں کر رہے۔“ وہ نزدیک ترین کسی ٹیلیفون پر گیا اور وہاں سے مسٹر ریڈی کو ٹیلیفون کیا جو جلد ہی موٹر سائیکل پر وہاں پہنچ گیا۔ دونوں آدمی کافی دیر تک محو گفتگو رہے اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ ہم پونچھ ہاؤس واپس چلے جائیں۔

جب ہم کیمپ واپس آئے تو کئی اور سنتری ہمارے کمروں کی حفاظت پر تعینات کر دیئے گئے اور بریگیڈیئرات بھر چکر لگاتا رہا۔ خاموشی اور سکون جس کی وجہ سے میں اس جگہ کو پسند کرتی تھی رخصت ہو چکے تھے۔ ہمارے اندر بھی کھچاؤ اور تناؤ زوروں پر تھا اور اب ہمارے ارد گرد بھی سنتری غیر معمولی طور پر محتاط تھے اور بار بار اُن میں سے کوئی ایک بالکل ساکت و جامد ہو کر وہ آوازیں سننے کی کوشش کرتا جو سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مسٹر ریڈی نے صبح صبح مجھے بتایا کہ کسی نے اُنہیں مطلع کیا ہے کہ قبائلی کسی بھی وقت یہاں چھاپہ مار سکتے ہیں۔ بہر حال ایسا ہوا نہیں۔

مسٹر ریڈی نے مجھے یقین دلایا کہ مطلوبہ اجازت نامہ ایک یا دو دن میں مل جائے گا۔ تین دن گزر گئے مگر ہم ابھی تک منتظر تھے۔ مسٹر ریڈی بھی نا اُمید ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ جموں کیسے جائیں گے۔ مسٹر قیوم جو پشاور کا پرائم منسٹر (وزیر اعلیٰ) ہے آج یہاں آرہا ہے اور میں اس معاملے میں اُس سے بات کروں گا۔“ ممکن ہے کہ آپ پشاور سے ہو کر انڈیا جا سکیں۔ مجھے اُمید ہے وہ ہماری مدد کر سکے گا۔“

شام کے وقت جب مسٹر ریڈی مسٹر قیوم سے ملنے جا رہا تھا تو اُس نے ویمل سے کہا کہ اگر وہ چلنا چاہے تو۔ ”تم کہتے ہو تم حملہ آوروں سے نہیں ڈرتے۔ آؤ! ہم تمہیں ایک حملہ آور دکھاتے ہیں۔“ ویمل اس پیشکش جس کے ذریعے اُسے ناچ کود کا موقع مل رہا تھا، پر بہت خوش تھا۔ تاہم مسٹر قیوم نے اس معاملہ میں مدد کرنے سے معذرت کر لی۔

اسی اثناء میں خبریں موصول ہوئیں کہ پاکستان نے ہمیں جیل بھیجنے کا حکم دے دیا ہے۔

پونچھ ہاؤس میں مختصر قیام کے دوران میں بالکل بے پرواہ ہو گئی تھی اور یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ یہ سب کچھ بہت اچھا ہے لیکن یہ حقیقی نہیں ہے، ایسی بارش کی خوشبو کی طرح جو کہیں دور برس رہی ہو، مصیبت کسی بھی وقت دوبارہ ہمیں دبوچ سکتی ہے۔ یہ معاملہ کچھ اس طرح تھا جیسے آپ کسی گرم اور آرام دہ ڈریسنگ روم میں جلاد کے ساتھ جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ تاہم جب یہ مصیبت فی الواقع رونما ہوئی تو میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ مسز مودی نے میری جانب الزام عائد کرنے والی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”میں ہمیشہ سے جانتی تھی کہ ہمارا یہی حشر ہوگا۔“ اُن سب نے محسوس کیا کہ میں لوگوں پر خواہ مخواہ اعتماد کرنے کی عادی ہوں۔ چوہدری صاحب اور درانی بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ شروع شروع میں میں نے ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہو گئی ہوتی تو یہ میری عزت افزائی کا ذریعہ ہو سکتی تھی لیکن جب یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تو اُن سب نے اسے ناقص قرار دیا۔



مسٹر ریڈی اس سارے معاملے کو ذاتی شکست سمجھ رہا تھا بلکہ کسی نہ کسی سطح پر وہ اپنے آپ کو بھی اس ناکامی کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ جیل کی گاڑی ہمیں لینے آگئی۔ اس میں چھ سنتری اور دو پولیس آفیسر تھے۔ وہ بہت غیر جذباتی اور لا پرواہ دکھائی دیتے تھے جیسے وہ پرانا فرنیچر جمع کرنے آئے ہوں۔ مسٹر ریڈی ہمارے لیے راشن سے بھرا ہوا ایک بیگ لایا اور دس دس روپے کے باریک بنی سے تہہ کیے گئے تین نوٹ میری مٹھی میں تھما دیئے۔ میں اُس کی اس مہربانی پر پریشان تھی لیکن میں جانتی تھی کہ اگر میں نے یہ روپے قبول کر لیے تو مسٹر ریڈی ہمارے جیل بھیجے جانے پر اپنے آپ کو کم ذمہ دار سمجھنے لگے گا۔ بہر حال میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے یہ رقم جلد از جلد واپس کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اُس کے ملازموں نے بھی ہماری بہت مدد کی اور میں حیران تھی کہ میں اس موقع پر معمول کے الوداعی جذبات کو مزید بھڑکائے بغیر اُن سے کیا کہوں اور کیسے شکریہ ادا کروں۔

اُن میں سے ایک نے جو مسلمان تھا ہجوم سے راستہ بناتے ہوئے پولیس آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”بمہربانی ماما جی کا اچھی طرح خیال رکھیں اور دیکھیں کہ اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ ہو۔“ اُس کی شائستگی سے بھی سادگی اور اُجڑ پن جھلکتا تھا۔

آفیسر اس کے اس دلیرانہ انداز پر محفوظ ہوا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، ہم ان سے کیا سلوک کریں؟“ اُس نے پوچھا۔

”اوہ! آپ کو معلوم نہیں کہ یہ ہمارے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔“  
مسٹر ریڈی اس بات پر خوش نظر آ رہا تھا کہ اُس کی محنت ضائع نہیں گئی۔

مجھے اب بھی معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کس وجہ سے ہمارے خلاف تھا۔ ہمیں یہ بتائے بغیر جیل بھیجا جا رہا تھا کہ ہمارا قصور کیا ہے۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے حکام کو مطلع کیا تھا کہ میں نے کئی کشمیریوں کو نئی حکومت کی مخالفت کرنے کے لیے تیار کیا ہے اور انہوں نے مجھے کچھ فوجی راز بتا رکھے ہیں۔ ان حالات میں اگر میں انڈیا چلی گئی تو پاکستان کو خاصا نقصان پہنچا سکتی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ ایک مشکل معاملہ تھا۔ پونچھ ہاؤس میں رہنے والوں کو یقیناً اس بارے کچھ پتا نہیں تھا اس لیے اُن کے راز انتہائی بچکانہ ذہن کو بھی نہیں اُکسا سکتے تھے۔ بہر حال اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اب پاکستان کی فوج سے متعلق سارے راز محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ان لوگوں سے گفتگو کی تھی جو شیخ عبداللہ کی حکومت کے لیے بہت جذباتی تھے۔ دراصل اس اُمید پر کہ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گی انہوں نے مجھے پیغامات دیئے جو مجھے ذاتی طور پر پنڈت جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ کو پہنچانے تھے۔

ہماری گاڑی جیل کے سامنے جا کر رُک کر اس لیے جس پولیس آفیسر نے ہمیں جیل کے اندر داخل کیا، کی شائستگی بالکل بے جا اور غیر ضروری تھی۔ اور اُس نے ایک ایسے مہربان کی طرح اعلان کیا جیسے وہ ہماری کوئی مدد کر رہا ہو۔

”آپ کو بی کلاس دی جائے گی لیکن مجھے یقین نہیں کہ آپ کے ملازم بھی آپ کے ساتھ رہ سکیں گے۔“  
 ”ایسی صورت میں ہم سب اُسی کلاس میں رہیں گے جس میں ملازم رہیں گے۔“ میں نے اُسے بتایا۔ میں جانتی تھی کہ اگر ملازموں کو ہم سے الگ کر دیا گیا تو ہم انہیں دوبارہ کبھی نہیں مل سکیں گے۔ وہ ہمیں ایک اندرونی صحن میں لے گیا جس کے ارد گرد ایک باغ بھی سجا ہوا تھا۔ اس کی ایک طرف چار کمرے تھے جن کے سامنے ایک برآمدہ تھا، ہمیں دے دیئے گئے۔ کمرے صاف ستھرے تھے اور یہاں باغ کے پھولوں کی وجہ سے ایک بے جوڑی شان و شوکت ٹپکتی تھی۔ ہم ابھی اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ پولیس آفیسر نے مجھے کہا کہ میں تمام زیورات اور پیسے اُس کے حوالے کر دوں اور یہ بھی کہا۔ ”جب میں رہا ہوں گی تو یہ مجھے واپس مل جائیں گے۔“  
 مجھے اپنے شوہر سے جدا ہوئے ٹھیک تین ماہ ہو چکے تھے۔ میں نے اُن کی یاد میں اپنے کمروں ہی میں کچھ قیدیوں کو کھانا کھلایا۔ اُسی روز میں نے سنا کہ باپو (مہاتما گاندھی) نے ہندوستان اور پاکستان کے بہتر تعلقات کے حق میں مرن بھرت رکھا ہوا ہے۔ تاہم کچھ آفیسروں نے اس خبر کو مجھے زچ کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا ملک دہری پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ آپ کے اپنے لوگوں کو احساس ہے کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔“ میں انہیں یہ بتانے کی جرات نہ کر سکی کہ پاکستان کے حکمران اپنے گریبان میں جھانکے بغیر خود بھی اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔



## ڈراؤنا خواب

ہمیں جیل میں دو ہفتے ہو گئے لیکن اس عرصہ میں میں نے کسی شرمناک اور قابلِ نفرت حادثے کے بارے نہیں سنا۔ میں اس خیال میں گم ہو جاتی تھی کہ میں نے یہاں آ کر مظفر آباد کے دوستوں کو ذلیل کیا۔ جب جموں کا تصور تھکے ہوئے ذہن پر حملہ کرتا تو میں مصیبت کے دنوں کے فاقے کی خواہش کو پرے نہ جھٹک سکتی۔ کچھ وقت کے بعد ہوش ٹھکانے پر آتے تو یہ سب غور و فکر عیاشی معلوم ہوتا تھا۔ جموں کے خوش کن انتظار اور مظفر آباد کے بارے احساسِ جرم کے ذریعہ ہستی نے اپنے جواز کے ذرائع تلاش کر لیے تھے۔ زندگی میں معنویت کی تلاش کا یہ ایک متبادل راستہ تھا۔

جب انسپکٹر اندر داخل ہوا تو اُس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ”خوش ہو جائیں! آپ کے لیے اچھی خبر لایا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ لوگ آج ہی جموں کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ مہربانی کر کے اپنا سامان باندھ لیں۔“

میں جموں کے بارے اتنے طویل عرصہ سے سوچتی رہی تھی کہ اب یہ خواہش اور یہ خیال بوسیدہ ہو کر دم توڑنا شروع ہو گئے تھے۔

چار بجے بعد از دوپہر ایک سٹیشن وگن ہمیں لینے کے لیے آگئی۔ جیل چھوڑنے سے قبل انسپکٹر نے میرے زیورات اور رقم واپس کر دی۔ ہم وگن میں کمشنر کے بنگلے پر گئے تو ہمیں کہا گیا کہ ہم کسی بھی قسم کی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ ایک کوچ تھی جو بالکل بند تھی اور اس میں روشندان نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور پھر بھی انسانوں سے چھلک رہی تھی۔ آپ کو دو مسافروں کے درمیان اپنی جگہ بنانے کے لیے دھکم پیل، کہنی مارنا اور سکڑنا پڑتا تھا۔ فضا ایسی اُمید سے جو ہر دل میں اور ہر چہرے پر نمایاں تھی معطر محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اب جب کوچ کا دروازہ بند ہوا تو میں اپنے آپ کو وقتی طور پر باسی پسینے سے پیدا ہونے والے اور تیزی سے پھیلنے والے لعفن کے بوجھ تلے دبی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

میرے سارے ہم سفر مسلمان تھے اور اُن میں سے ایک کو جو مظفر آباد سے ہمارے ساتھ آیا تھا میں نے پہچان بھی لیا۔ میں نے اُس سے دیگر مسافروں کے سفر کی وجہ اور منزل وغیرہ کے بارے معلومات حاصل کیں۔ اُس کا جواب بر محل نہیں تھا۔ اس کے برعکس اُس نے بس میں موجود آفیسروں اور اُن کے رشتہ داروں کے بارے لمبی کہانی سنائی۔ ”ان میں سے ایک میرپور کا وزیر ہے اور اُس کا بھائی پشاور کا وزیر اعظم (وزیر اعلیٰ) ہے۔ یہاں ایک پولیس سپرینٹنڈنٹ بھی بیٹھا ہوا ہے۔“

ہماری گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشوں پر پردے لگے ہوئے تھے اور ہمارا قافلہ جارہا تھا۔ پہلے ایک موٹر کار نکلی جس کے پیچھے سپاہیوں سے بھرا ہوا ٹرک تھا۔ ہماری بس اور ایک گاڑی ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ ہم نے رات جہلم میں گزاری۔

میں نے صبح اپنے مظفر آباد والے ساتھی سے پوچھا۔ ”ہم جموں باڈر پر کب پہنچیں گے؟“ اُس نے کہا۔ ”ہم تو میرپور جا رہے ہیں۔“ لمحہ بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید اس آدمی نے یہ اندازہ کر لیا ہو کہ میں جموں پہنچنے کے لیے بیتاب ہوں اس لیے یہ مجھے تنگ کر رہا ہے۔ یہ یقین کرنے کے لیے میں نے ڈپٹی کمشنر سے ملنے کے لیے کہا۔

”آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

”واقعی ہم میرپور جا رہے ہیں۔ اُس نے لاہور واپسی سے جواب دیا۔ ”یہ بہت غلیظ حربہ ہے۔ ہمیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ہم جموں باڈر پر جا رہے ہیں۔“

اُس نے کہا۔ ”آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دیا جا رہا۔“ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اُس نے کہا۔ ”شاید آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میں کشمیر میں جج رہا ہوں۔ مجھے اچھے وقتوں میں معلوم ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اس لیے میں نے اپنی فیملی پشاور منتقل کر دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مہتا صاحب کو بھی سب معلوم تھا۔ انہیں بھی یہی کرنا چاہیے تھا۔“

”معاف کیجئے۔ لیکن مہتا صاحب اس بارے بہت مضبوط موقف رکھتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمیں کہیں اور بھیجنے کی وجہ سے دوسرے لوگ جن کی وہ دیکھ بھال کر رہے تھے بے عزتی محسوس کریں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہمیں بھی دیگر لوگوں کی طرح حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس صورت حال کو اس طرح بھی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔“

میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اُس نے میری آواز کے زیر و بم کا نوٹس ہی نہیں لیا یا اُسے نظر انداز

کر دیا۔ اُس نے صرف یہ کہا۔ ”مجھ پر یقین کریں کہ آپ کو بالکل فکر نہیں کرنی چاہیے، میرا خیال ہے آپ نے سنا ہوگا کہ علی بیگ کیمپ دنیا کا جہنم ہے۔ ہم آپ کو وہاں نہیں رکھیں گے۔ دتیال میں ایک ٹھیکیدار ہے، وہ بہت خوش حال آدمی ہے۔ اُس نے اپنا ایک بڑا گشتی مکان بازیاب خواتین کے لیے مختص کیا ہے۔ آپ چوں کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کی قیدی ہیں اس لیے آپ کو راولپنڈی میں نہیں رکھا جاسکتا۔ دتیال سے ہندوستان جانا زیادہ آسان ہے۔“

جب منسٹر میرے ساتھ بات کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وینا اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ اُسے پہچان گئی اور کہا۔ ”آپ کی بیٹی بھی میری ہم جماعت تھی۔ اب وہ کہاں ہے؟“

”وہ سب پشاور میں ہیں۔ آپ کے لیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، میرے بچے! بالکل فکر نہ کریں۔“

میرے لیے مسز مودی کو یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ ہم اب بھی مصیبت سے نہیں نکلے۔ میں نے اپنے آپ کو معمولی چور کی طرح محسوس کیا جو اپنے جرم کا اعتراف کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ میں نے اُسے کمشنر کے ساتھ گفتگو کے بارے بتایا اور ساتھ ہی کہا۔ ”مجھے اب بھی معلوم نہیں کہ ہمیں مزید کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سب کو مظفر آباد سے دُور لے کر آگئی ہوں۔“ مسز مودی زیادہ حوصلہ افزائی کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ خاموش رہی۔ اُس نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ میں اب بھی اپنے کئے پر پچھتانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

جب اندھیرا مکمل چھا گیا تو ہم دتیال کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا ٹرک رضا یوں سے بھرا ہوا تھا اور ہم انہی پر بیٹھ گئے۔ ہم نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہے تھے اور بس ایک پراسرار چیخ کے ساتھ تند و تیز آندھی کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ بچے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے تھے اور جو زیادہ چھوٹے تھے وہ خوفزدہ ہو کر رونا شروع کر دیتے تھے۔ ڈرائیور قبائلیوں کے جتھوں، جو سڑک کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے، سے بچنے کے لیے بار بار بریکوں کو زور لگا کر دباتا تھا۔ وہ اس کو راستہ دیتے ہوئے اُس پر چیختے بھی تھے۔

بالآخر جب ٹرک رُکا تو وزیر جو کار میں آ رہا تھا، میرے پاس آیا اور کہا۔ ”دتیال یہاں سے صرف دو میل ہے اور باقی راستے پر گاڑی نہیں چل سکتی۔ اب آپ کو پیدل جانا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تو آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا لیکن میرا ایک آدمی آپ کے ساتھ وہاں تک جائے گا۔ اوہ! لیکن آپ کے ملازم آپ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔ مردوں کو اُس کیمپ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“



میں نے اُس کو بتایا کہ میں کسی بھی حال میں اپنے ملازموں سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔

اُس نے ہار مان لی۔ ”ٹھیک ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں آپ کو اس کھیلے سے مستثنیٰ کر دوں گا۔ جب منگل بھائی کی فیملی کیمپ میں گئی تو جاگیردار کو اُن کے ساتھ کیمپ میں نہیں رہنے دیا گیا اور اُسے علی بیگ کیمپ میں جانا پڑا۔ بعد میں وہ وہاں مُردہ پایا گیا۔“

ہم نے اپنی چند چیزیں اکٹھی کر کے اٹھائیں اور مین روڈ سے دُور نکل گئے۔ ایک تنگ پیدل راستہ گندم کے کھیتوں سے گزرتا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے سرگوشی میں کہا۔ ”آپ کو یہاں کسی طرح بھی شور نہیں کرنا۔ جتنی آہستگی اور خاموشی سے چل سکتی ہیں چلیں۔ کسانوں کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کوئی تجاوز کر رہے ہیں۔ اگر اُن کو معلوم ہو گیا تو میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ وہ گرمجوشی سے ہمارا استقبال نہیں کریں گے۔ وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔“ قسمت نے یاوری کی اور ہم قدم قدم اٹھاتے چوری چھپے جیسے ہم کوئی بڑا کھیل کھیل رہے ہیں، چلتے گئے۔ میں اُس وقت ذرا چونک گئی جب میرے پاؤں کے نیچے آنے کی وجہ سے لکڑی کے ایک خشک ٹکڑے نے چنخنے کی آواز دی اور گائیڈ بار بار پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے میرے تیز اور بھاری سانسوں کی آواز کو بھی پسند نہیں کیا۔ ہم کیمپ میں پہنچنے سے پہلے تقریباً دو میل چلے ہوں گے اور ایک سنتری ہمیں اندر لے گیا۔

یہ عمارت تقریباً سڑک ہی پر کھڑی تھی اور ہم نے اپنے آپ کو ایک مذہم روشنی والے کمرے میں پایا۔ یہ عمارت کیا تھی انسانوں کا کباڑ خانہ تھا جس میں گنجائش سے کہیں زیادہ لوگ بند کر دیئے گئے تھے۔ کچھ خواتین آنکھیں بند کر کے دُنیا وافیہا سے بے خبر چار زانوں ہو کر بیٹھنے پر مجبور تھیں اور کچھ اپنے سروں کو گھٹنوں میں دبا کر گہری سوچ و بچار میں تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک خاتون پشیمانی اور افسوس کے عالم میں ایک روتے چلاتے بچے کو خاموش کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے ایک ایسی التجا کا تاثر ملتا تھا جیسے وہ آسمان سے رحم اور دُنیا کے خاتمے کی بھیک مانگ رہی ہو۔ چند خوش نصیب خواتین جو محض دُکھ درد سے اکتائی ہوئی تھیں وہ گھاس کے بستر پر سوئی پڑی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف ناگوار نیلی ہوا پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ ایسے بادل کی طرح تھی کہ پہاڑ پر چڑھتا ہوا آدمی اُسے چھو سکتا ہو۔

سب آنکھیں بیٹری (Battery) کی طرح مجھ پر گاڑ دی گئیں۔ کچھ خواتین نے جو اپنے آپ سے بیزار معلوم ہوتی تھیں اسی انداز میں ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دیگر نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میرے اندر کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ چند کے علاوہ دیگر تمام جوان تھیں لیکن اُن کے شباب کی ساری تابانی ماند پڑ چکی

مسترد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ سب اُس عورت کی طرح محسوس کرتی تھیں جسے اپنے اُس شوہر نے گھر سے نکال دیا ہو جس کے ساتھ وہ کسی پُر اسرار خوف کی وجہ سے محبت کرتی تھی اور اب ایک ایسے شخص کی بانہوں میں چلی گئی ہو جس کی نہ اُسے کوئی خواہش اور نہ ہی اس کے ساتھ ہم آہنگی (Understanding) ہو۔ اُنہیں شدت سے اپنی نظروں میں اہمیت اور قدر و قیمت حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر حکومت کے کارندے بھی ان خواتین پر بُری نظر رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً کیمپ میں آتے جاتے تھے لیکن کیمپ کمانڈر نے مختلف طریقوں سے اُن کے راستے میں مشکلات کھڑی کی ہوئی تھیں۔ یہ کیمپ کمانڈر ایک پچاس سالہ اُونچے قد کا آدمی تھا۔ عمر نے اُس کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ ایک ایسی مشفق شخصیت کا مالک تھا کہ دیکھنے والا اُس کی شرافت پر یقین کرنے لگتا تھا۔ میں نے اُس کی بہت تعریف سنی تھی اُسے ٹھیکیدار کہتے تھے۔ ☆

ظاہر ہے اُسے بھی میرے بارے کچھ علم تھا اس لیے اُس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اُس نے کہا۔ ”اچھا! تو آپ کو بھی یہیں لایا گیا ہے! آپ کے حق میں اپنی پوری کوشش کروں گا لیکن پھر بھی آپ کو متنبہ ضرور کروں گا کہ اس کیمپ میں زندگی آسان نہیں ہے۔ قبائلی کثرت سے یہاں آتے ہیں اور میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اُنہیں کیمپ سے دُور رکھوں جو میں کسی نہ کسی طرح کر رہا ہوں۔ کئی بے حد خوبصورت خواتین بھی یہاں ہیں اُن کے مسلمان شوہر مسلسل اُن کا پیچھا کر رہے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اُنہیں واپس حاصل کریں اور عجیب بات یہ ہے کہ کچھ خواتین بھی واپس اُنہی کے پاس جانا چاہتی ہیں۔“

میں نے گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ خواتین ذہنی طور پر نارمل نہیں ہیں اور آپ نے اس بات کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اُن کا ذہن محبت اور خوف کے درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ سماجی طور پر اچھوت پن (Boycott) کا شکار ہونے سے ڈرتی ہیں اس لیے اپنے مسلمان شوہروں کے پاس واپس جانے کو محفوظ راستہ سمجھتی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کا کیا مطلب ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اپنی پوری کوشش کروں گا کہ وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنے مستقبل کا انتخاب کریں۔ پاکستان کی حکومت نے مجھے اس کیمپ کی حفاظت کے لیے مطلوبہ تعداد میں محافظ فراہم نہیں کیے۔ آپ اچھی طرح تصور کر سکتی ہیں کہ میرے لیے تنہا اس دیرانے

میں اتنی بے شمار خواتین کی حفاظت کتنا مشکل کام ہے۔ اب ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا جائے۔ پہلی منزل بالکل پُر ہے۔ یہ کمرہ گیٹ سے بالکل قریب ہے اس لیے محفوظ نہیں لیکن آج رات آپ یہاں سو سکتی ہیں۔ کل میں آپ کے لیے اپنے ساتھ والا کمرہ خالی کروادوں گا۔ کافی دیر ہو چکی ہے اس لیے مجھے چلے جانا چاہیے۔“

ہمارا کمرہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ملازمین نے لوہے کے صندوق کوٹنے میں ڈھیر کیے اور ہمارے سونے کے لیے فرش پر خشک گھاس بچھادی۔ جب تاریکی ہو گئی تو مجھے یہاں آنے کے بعد پہلی مرتبہ ڈر سا لگا۔ میرے ذہن میں اُن خونچکاں کہانیوں کی تفصیل جو میں نے بعد از دو پہر سنی تھیں ایک ایک کر کے گھومنے لگیں۔ اب وہ کہانیاں میرے اپنے تجربات کا حصہ بن چکی تھیں اور میں نے پوری شدت سے انہیں اپنے تصوّرات میں جگہ دے دی تھی۔ میں نے اس غلیظ ڈرامہ کے کرداروں کو خوف کے مارے بدل دیا اور پھر اس ڈراؤنے خواب سے نئی شروعات کے لیے جاگ اُٹھی۔

دن کے پہلے حصے میں جب میں خواتین سے ملی تو مجھے اُن کی صحیح صورتِ حال سمجھ میں آئی۔ اب میں خود اُن کی زندگی کے تجربات سے گزرنے لگی تھی۔ میں شکر گزار تھی کہ حقیقی معنوں میں اُن کے دکھوں کو محسوس کر سکی۔ مجھے یہ بات اچھی لگی کہ کسی دوسرے کے دکھ درد پر رو لینے سے اپنے دکھ درد کم اور غیر اہم محسوس ہونے لگتے ہیں۔ مجھے لگا کہ میں نے قسمت کی بازی ابھی ہاری نہیں ہے اس لیے مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ان بدنصیب خواتین کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ مجھے کوشش کر کے انہیں ذہنی طور پر دوبارہ نارمل حالت میں لانا چاہیے۔

شام کے وقت گو بند پور کالج کے دونو جوان لڑکے کیمپ میں آئے۔ وہ سماجی کارکن تھے اور اُن میں ایک میر پور کے وزیر کا بھتیجا تھا۔

”آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ اور آپ کی آنکھیں اس قدر سُوجھی ہوئی ہیں۔“ اُس نے کہا۔

”کیا آپ کا خیال ہے کہ کوئی آدمی یہاں خوش بھی رہ سکتا ہے؟ ذرا اس کیمپ میں قید خواتین پر نگاہ ڈالیں۔ اُن کے پاس کپڑے تک نہیں ہیں اور کھانے میں انہیں دو روٹیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ وہ شدید تھکاوٹ کے باعث سوتی ہیں اور کیا آپ توقع رکھتے تھے کہ تالیوں کی گونج میں آپ کا استقبال کیا جائے گا؟“ کبھی کبھی دکھ درد کی شکایت کرتے ہوئے رونا بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ میرے اس انداز نے اپنا کام کیا۔ لڑکا خود بھی بے آرامی اور دکھ محسوس کرتا ہوا دکھائی دیا اور وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا۔ اُس نے کہا۔ ”جو کچھ ہو چکا ہے اُسے بھول جائیں۔ ہم یہاں آپ کی دیکھ بھال کرنے آئے ہیں میں جانتا ہوں کہ یہاں کے حالات بہت

خراب ہیں لیکن اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ علی بیگ کیمپ کا کیا حال ہے تو آپ اپنے کو خوش قسمت سمجھنے لگیں گی۔“

”لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں جنہیں آسانی سے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ گارڈز عورتوں کے ساتھ بہت بدتمیزی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ان خواتین کو کچھ کپڑے اور چادریں تو دے ہی سکتے ہیں۔“ کمانڈر بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے گارڈز کو بلایا اور کہا کہ اگر آئندہ اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی ہے تو وہ اُسے گولی مار دے گا۔ جب وزیر ایک مرتبہ کیمپ کا معائنہ کرنے کے لیے آیا تو اُس نے پرانی رضائیاں واپس جمع کر کے نئی رضائیاں تقسیم کیں۔



## سوشل بائیکاٹ کا خوف

کیمپ کمانڈر اپنے کام کو بہت سنجیدگی سے کرتا تھا۔ وہ یوں تو صرف ایک منتظم تھا لیکن انتہائی صاف و شفاف انسانی روئے کا حامل تھا اور کیمپ میں محصور خواتین کے مسائل کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ اس وجہ سے مسلسل پریشان رہتا تھا کہ کیمپ کے حالات اچھے نہیں ہیں اور اس سلسلہ میں کسی ذمہ دار شخصیت سے بات ہونی چاہیے۔ دتیال سے چار میل کے فاصلے پر گو بند پور کا گاؤں تھا جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کا ایک ضلعی ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ اکثر آفیسر اور پولیس کے سپاہی قبائلی تھے جو حملہ آوروں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے جو ان ہی کے علاقے کے لوگ تھے۔ اس لیے وہ امن و امان قائم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حملہ آور مقامی لوگوں کو لوٹ کر اور ان کے مال مویشی چھین کر انہیں ذبح کر لیتے تھے جبکہ آفیسران کے خوف سے ذرہ بھر مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک شام کو کمانڈر میرے پاس کافی دیر بیٹھا رہا اور تفصیل سے باتیں کیں۔ اُس نے کہا۔ ”یہاں اکثر عورتیں ایسی ہیں جو ہندوستان نہیں جانا چاہتیں لیکن بہت سی جانے کے لیے بیتاب بھی ہیں۔ اب اُن سب سے سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں سوال و جواب ہوں گے اور اُن کے بیان ریکارڈ کیے جائیں گے۔ جو ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنانا چاہتیں انہیں اپنے اُن مسلمان شوہروں کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا جن سے چھین کر انہیں لایا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ بہت ہی عجیب و غریب اور خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کے انتخاب کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ کبھی یہ خواتین بہت اچھی زندگی گزار رہی تھیں۔ اُن کی بہت اچھی طرح پرورش کی گئی ہے اور نہایت شائستہ اور تہذیب یافتہ ہیں۔ اب وہ نہایت عام لوگوں کے ساتھ رہ کر واپس آئی ہیں جن کے ساتھ زندگی گزارنے کی انہیں عادت نہیں تھی۔ ان میں اکثر لوگ اجڑا اور گنوار قسم کے تھے جنہوں نے ان عورتوں کو چھپر پھاڑ کر ملنے والی جائیداد سمجھا ہوگا۔ وہ مقابلے کا جو ہر کھو بیٹھی ہیں اور بالکل کمزور اور بزدل ہو چکی ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی احساس ہوتا کہ نئے شوہروں کے پاس واپس جانے



## سوشل بائیکاٹ کا خوف

کیمپ کمانڈر اپنے کام کو بہت سنجیدگی سے کرتا تھا۔ وہ یوں تو صرف ایک منتظم تھا لیکن انتہائی صاف و شفاف انسانی رویے کا حامل تھا اور کیمپ میں محصور خواتین کے مسائل کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ اس وجہ سے مسلسل پریشان رہتا تھا کہ کیمپ کے حالات اچھے نہیں ہیں اور اس سلسلہ میں کسی ذمہ دار شخصیت سے بات ہونی چاہیے۔ دتیاں سے چارمیل کے فاصلے پر گوہر پور کا گاؤں تھا جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کا ایک ضلعی ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ اکثر آفیسر اور پولیس کے سپاہی قبائلی تھے جو حملہ آوروں پر نظر رکھنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے جو اُن ہی کے علاقے کے لوگ تھے۔ اس لیے وہ امن و امان قائم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حملہ آور مقامی لوگوں کو لوٹ کر اور ان کے مال مویشی چھین کر انہیں ذبح کر لیتے تھے جبکہ آفیسر اُن کے خوف سے ذرہ بھر مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک شام کو کمانڈر میرے پاس کافی دیر بیٹھا رہا اور تفصیل سے باتیں کیں۔ اُس نے کہا۔ ”یہاں اکثر عورتیں ایسی ہیں جو ہندوستان نہیں جانا چاہتیں لیکن بہت سی جانے کے لیے بیتاب بھی ہیں۔ اب اُن سب سے سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں سوال و جواب ہوں گے اور اُن کے بیان ریکارڈ کیے جائیں گے۔ جو ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنانا چاہتیں انہیں اپنے اُن مسلمان شوہروں کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا جن سے چھین کر انہیں لایا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ بہت ہی عجیب و غریب اور خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کے انتخاب کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ کبھی یہ خواتین بہت اچھی زندگی گزار رہی تھیں۔ اُن کی بہت اچھی طرح پرورش کی گئی ہے اور نہایت شائستہ اور تہذیب یافتہ ہیں۔ اب وہ نہایت عام لوگوں کے ساتھ رہ کر واپس آئی ہیں جن کے ساتھ زندگی گزارنے کی انہیں عادت نہیں تھی۔ ان میں اکثر لوگ اجڑا اور گنوار قسم کے تھے جنہوں نے ان عورتوں کو چھپر پھاڑ کر ملنے والی جائیداد سمجھا ہوگا۔ وہ مقابلے کا جو ہر کھو بیٹھی ہیں اور بالکل کمزور اور بزدل ہو چکی ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی احساس ہوتا کہ نئے شوہروں کے پاس واپس جانے

کے بارے اُن کا انتخاب کیا ہونا چاہیے تو میں اتنا ناخوش نہ ہوتا۔ مجھے حیرت ہوگی اگر آپ ان میں یہ احساس پیدا کر سکیں کہ انہیں فرسودہ اور قدامت پسند جنتا کی نفرت کے خوف سے اپنی کشتیاں نہیں جلائی چاہیں۔“

میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں اُس کی مدد کے لیے جو کچھ بھی کر سکی ضرور کروں گی۔

میں نے تمام عورتوں کو اکٹھا کیا کہ ہر صبح اور شام کو دعائیہ اجتماع ہوا کرے گا اور اُن سب کو حاضر ہونا چاہیے۔ اُن میں سے کچھ نے اس خیال کا سواگت کیا۔ دوسری خواتین نے کہا کہ ”ہم اب ہندو نہیں رہیں۔“ میں نے وضاحتاً کہا کہ حمد گانے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ انہوں نے عقیدہ بدل لیا ہے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں انہیں دوبارہ ہندو بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔

میرا ذہن بالکل صاف تھا کہ مجھے کیا کچھ کرنے کی اُمید ہے۔ وہ اپنے دُکھ کو اکیلی اپنے اندر سمو کر اپنی ساری شخصیت کو زخمی کر چکی تھیں۔ انہیں آزادی سے بات کر کے ان دُکھوں کو بھولنے کی ضرورت تھی۔ وہ اس قدر مریض بن چکی تھیں کہ وہ اُن دوسرے لوگوں کی صحبت میں بھی جنہوں نے اُن کی طرح اور اُن کے ساتھ دُکھ اٹھائے تھے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی تھیں اور اپنی شخصیت کے مردہ ہیولے (Dead Image) پر آنسو بہائے بغیر روتی رہتی تھیں۔ انہیں دوسروں پر افسوس کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس پس منظر میں مجھے دوسرے دن میٹنگ میں کثرت حاضری پر بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے پورے زور سے ہمہ تن گوش ہو کر اس اُمید پر میری گفتگو سننے کی کوشش کی کہ وہ یہاں سے نا اُمید ہو کر واپس جائیں تاکہ انہیں اگلی میٹنگ میں نہ آنا پڑے۔ میں نے اختصار کے ساتھ بات کی۔ ”میں ایک دفعہ سری نگر میں ایک سادھو گن بابا سے ملی۔ اُس نے مجھے چند گیت سکھائے تھے۔ اُن کا موضوع خاص طور پر مذہبی نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ گاتے ہوئے محسوس کریں گی کہ وہ آپ کو خوش اور حوصلہ مند کریں گے اور جلد ہی آپ بھولنا بھی سیکھ جائیں گی۔“

وہ میری پیروی کرتے ہوئے الفاظ دہراتی رہیں۔ گیت گانے میں نہ ہم آہنگی تھی اور نہ ہی ترنم۔ اُن کی آوازوں میں لرزش تھی، وہ تناؤ سے بھرپور تھیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا شاید اس لیے کہ میں یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ اُن کے چہروں کی لکیں قدرے آسودہ ہو جائیں، اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ خالی آنکھوں سے گھورنا بند کر دیں۔ وہ میرے ارد گرد جمع ہو گئیں اور دوستانہ رویے کا اظہار کرنے لگیں۔ وہ اپنے اس لاشعوری عزم کو کہ وہ اپنے دُکھوں سے جُدا نہیں ہوں گی، کو بھول چکی تھیں بلکہ اُس کے بارے باتیں کرنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں دوزانوں ہو کر فرش پر درمیان میں بیٹھ گئی اور انہیں بھی اپنے ارد گرد بٹھالیا۔ عجیب بات ہے کہ اُن کی گفتگو سے درد کا کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوتا تھا۔ ہم سب جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے تکلیف اور دُکھ کا ذائقہ پہلے ہی

چکھ چکے تھے اور اُسے اچھی طرح سمجھتے بھی تھے۔ اس لیے ان کی خشک اور بد مزہ تفصیل کو مزید پھیلانے سے منہ کا ڈانٹہ اور بھی خراب ہوتا تھا۔ وہاں ایک عورت ایسی تھی جس کا شوہر بچے اور والدین سب قتل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ ایک شام کو حملہ آوروں نے اُس کے گاؤں کو محصور کر کے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے ہر چیز کو وحشیانہ پاگل پن اور جشن کے انداز میں تباہ و برباد کیا۔ لوگ اپنے گھروں میں باورچی خانوں میں اور بسترؤں کے نیچے چھپ گئے۔ حملہ آوروں نے ہر طرف تباہی مچادی، روپے اور کپڑے لوٹ لیے، لوگوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ قاتل کا کھانا اُن کے جھکے ہوئے جسموں پر ایک زوردار آواز کے ساتھ پڑنے لگا اور وہ بے ہوش ہوتی ہوئی خواتین کو زبردستی یہ منظر دیکھنے پر مجبور کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ”ایک کافر کی زندگی اس قابل نہیں ہے کہ اُس پر چھ آنے کی گولی ضائع کی جائے۔“ قاتل اور ڈاکو جب اپنے فعل بد کی اس طرح تشریح کرتا تھا تو اُس کے ساتھی زوردار قہقہہ لگاتے تھے۔ اس کے فوراً بعد قاتل کافروں کی بیویوں سے شادی کی رسم ادا کرنے لگتے تھے۔ اُس شوہر کی بیوی جس کے خون کے گرم گرم قطرے اب بھی بہہ رہے تھے۔ ”میں مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ کاش میں وہ قہقہہ کبھی نہ سُن سکتی۔“ اُس خاتون نے کہا اور اپنے کانوں کو اپنی انگلیوں سے بند کر دیا۔ اُن بھڑے اور کھردرے قہقہوں نے اُس کی بو جھل یادداشت کو اس طرح کچلا ہوا تھا جیسے اداسی کے گیت کی سُر میں مدھم اور دبی دبی سی ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ تھم کر بار بار بلند ہونے کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔

ہم صبح اور شام کو ملنے لگیں اور رفتہ رفتہ خواتین کو باہر کی دُنیا اور اُس میں انسانیت کے بارے معلوم ہونا شروع ہوا۔ مجھے اُس وقت شکر گزاری کا احساس ہونے لگا جب کبھی کبھی میں خواتین کو ہوا میں چٹکی لے کر کوئی رائے دیتے ہوئے یاد دہانی ہوئی ہنسی کے ساتھ کسی کے مذاق کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھتی یا سنتی۔ اُن میں سے کچھ نے مجھے بتایا کہ وہ خوش خوش اس میٹنگ کا انتظار کرتی ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کیمپ میں حالات بہتر ہونے لگے۔ اگرچہ ہمیں اتنا کچھ نہیں ملتا تھا جو ہماری ضرورت تھی پھر بھی ہمیں کھانے کے لیے بہتر کھانا ملنے لگا۔ ہم صاف ستھری چادروں پر نہیں سوتی تھیں لیکن ہم رات بھر سردی سے کانپتے ہوئے بھی نہیں گزارتی تھیں۔ رات کی نگرانی مزید سخت کر دی گئی اور جب ہم صبح سو کر اُٹھتی تھیں تو ہماری نیند پہلے سے زیادہ پرسکون ہونے لگی۔

خواتین برابر کیمپ میں آرہی تھیں جس کی وجہ سے ہماری تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ دوسری خواتین کو جنہوں نے بالکل انہی کی طرح مصائب برداشت کیے دیکھ کر حیران ہوتی تھیں۔ اب

مجھے سمجھ آنے لگی ہے کہ بہت سی خواتین دوبارہ مسلمانوں کے گھروں میں جانے کے معاملے میں خاموشی سے رضامند کیوں ہو جاتی تھیں۔ اُن کے مسلمان شوہروں نے اُنہیں ڈرا دھمکا کر یہ یقین دلایا ہوا تھا کہ تمہیں یہاں سے نکال کر کیمپ میں لے جانے کی باتیں محض دھوکہ ہیں۔ اُن کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اُنہیں دوسرے قبائلیوں کے حوالے کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اگر انہیں ہندوستان لے جایا بھی گیا تو اُنہیں بہر حال نفرت کا نشانہ بننا پڑے گا۔

نئی آنے والیوں سے نبھاؤ بہت مشکل تھا۔ وہ میٹنگ میں بہت کم آتی تھیں اور مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تشکیک کی یہ فضا زیادہ پھیل نہ جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُن کی زندگیوں میں اُمید کی کرن جگاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ اُن کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا کہ وہ اٹیہستی سے دستبردار ہو کر مسلمان شوہروں کے ساتھ ناخوشگوار زندگی گزارنے پر صرف اس لیے تیار ہو جائیں کہ اُنہیں مستقبل کا خوف ہے۔ لیکن جب ایک مرتبہ میں نے انہیں اس راہ پر ڈال دیا تو وہ دوسروں سے زیادہ تیزی سے بحال ہونے لگیں۔

پہرے دار ہمارے خلاف بغض رکھتے تھے کیوں کہ ایک مرتبہ میں نے کمانڈر سے اُن کی بدتمیزی کی شکایت کی تھی۔ جب وہ نہیں ہوتا تھا تو وہ خواتین کے ساتھ بدتمیزی کرتے تھے اور اُن سے معمول سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اکثر خواتین جنہیں گھروں میں ملازم رکھنے کی عادت تھی اور فارغ البال گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس صورت حال سے ناراض تھیں اور مجھ سے شکایت کرتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اس بارے کمانڈر سے بات کروں۔

میں نے انہیں بتایا۔ ”لیکن یہ کوئی سخت یا بُرا کام نہیں ہے۔ دراصل میں تو ہر روز اپنا کمرہ صاف ستھرا کرنے کے بعد بہتر محسوس کرتی ہوں۔ آخر کار ہم ہی یہاں رہتی ہیں اور گھر بہت بے رونق اور غلیظ لگتا ہے۔ یہ آپ کے لیے بے حد مفید ہوگا کہ آپ پکا ارادہ کر لیں کہ آپ رات دن سوچتے سوچتے گزارنے کے بجائے کچھ نہ کچھ کرتی رہیں گی۔“ اس طرح ہر صبح ہم کمرے میں جھاڑو پھیرتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں اور ”پوچا“ مارتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ یہ سب کام کرنے کے بعد وہ زیادہ بہتر محسوس کرتی ہیں۔

گاؤں کی مسلمان خواتین بھی اکثر ہمارے کیمپ میں آتی تھیں اور ہمیں طویل گفتگو میں مصروف رکھتی تھیں۔ وہ اُن ہندو لڑکیوں سے حسد کرتی تھیں جنہیں اُن کے گھروں میں رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے اُن کے شوہر پہلے کی طرح اُن پر توجہ نہیں دیتے تھے۔

میں نے انہیں بتایا۔ ”اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو میں اس قدر بے بس نہ ہوتی۔ یہ صورت حال



سوائے آپ کے خود غرض شوہروں کے، جن کی ہوس کا کوئی ٹھکانہ نہیں، کسی کے لیے بھی موزوں اور قابل قبول نہیں۔ آپ کو کوشش کر کے ایسی شادیوں کو روانہ چاہیے۔ آپ کے گھروں کو ایسے مداخلت کاروں کے ذریعے توڑا جا رہا ہے جو خود بھی مداخلت کے لیے رضامند نہیں ہیں جس کی وجہ سے نہ تو پہلی بیوی پر سکون ہے اور نہ دوسری۔“ وہ فوری طور پر میرے ساتھ متفق ہو گئیں، واپس گھر گئیں اور اپنے شوہروں سے جھگڑا شروع کر دیا۔ اُس کے بعد انہوں نے باقاعدگی سے دیگر اغواء شدہ ہندو لڑکیوں کا اُتہ پتا بتانا شروع کر دیا۔ ہر صبح سپاہیوں کا ایک دستہ نکلتا اور چار پانچ لڑکیوں کو تلاش کر کے لے آتا۔ کیمپ کمانڈر اچھی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا اور اگر اُس نے مجھے پوری آزادی نہ دی ہوتی تو یہ سب ناممکن تھا۔

اگرچہ ہمارے کیمپ کی زندگی نسبتاً محفوظ تھی۔ لیکن پڑوس کے گاؤں اب بھی حملہ آوروں کے لیے خوشگوار شکار گاہوں کی طرح تھے۔ ہر چند روز کے بعد قبائلیوں کا کوئی نہ کوئی دستہ نوشہرہ کے محاذ پر جاتے ہوئے گاؤں میں ٹھہرتا۔ دن بھر کی لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کے بعد وہ صبح سویرے تک ناؤ نوش میں مصروف رہتے۔ وہ کبھی بھی کسی گاؤں کا مکمل صفایا کر کے نہیں جاتے تھے بلکہ کچھ نہ کچھ دوسرے چکر کے لیے بھی چھوڑ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ معمول کی زندگی بحال ہونے کے بعد بھی بے شمار قبائلی واپس آ کر لوٹ مار میں اپنا حصہ مانگتے تھے۔ اُن میں نا تجربہ کاری کی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ اُن کا طرز عمل انتہائی تجربہ کار ایذا رسانوں (Sadist) والا تھا۔

ایک دن ہمارے کیمپ کے باہر قبائلیوں کے ایک گروہ اور مقامی مسلمانوں کے درمیان ایک جھڑپ شروع ہو گئی۔ اگرچہ حالات مکمل طور پر حملہ آوروں کے حق میں تھے اور اہل گاؤں کو آسانی سے شکست ہو گئی لیکن انہوں نے کسی طرح ایک قبائلی کو قتل کر دیا۔ حملہ آوروں نے گاؤں میں کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا اور قسم کھائی کہ واپس جانے سے پہلے ہر ایک کو موت کے گھاٹ اُتار کر جائیں گے۔ انہوں نے تمام مویشیوں کو ذبح کر دیا، غلہ کے کوٹھاروں (گودام) کو خالی کر دیا اور تین دنوں میں سب کچھ ہضم گئے۔ گاؤں کے لوگ مدد کے لیے مقامی پولیس کے پاس گئے لیکن وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ ذرا بھی مداخلت نہ کر سکے۔ معاملہ مرکزی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا جس نے بالآخر حملہ آوروں کو اگلے مورچوں پر بھیج دیا۔

کئی حادثات میں سے یہ صرف ایک ہے۔ خواتین یہ کہانیاں سن کر خوف سے کانپتی رہیں۔ ٹھیکیدار کو مرکزی حکومت سے زیادہ مدد نہیں ملی لیکن اس کے باوجود اُس نے ہمیں محفوظ ہونے کا احساس دلانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا۔ وہ ہر کمرے میں گھوم پھر کر سب کو یقین دلاتا تھا کہ جب تک اُس میں ذرا بھی سکت باقی ہے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔





## بالآخر ہندوستان روانگی

پڑوسی گاؤں کے ایک محلہ سے کچھ مسلمان کپڑے اور پیسے لے کر کیمپ میں آئے۔ انہوں نے کیمپ کمانڈر سے اجازت طلب کی کہ وہ چیزیں اُن لڑکیوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے ساتھ رہ کر واپس آئی ہیں۔ کیمپ کمانڈر اُن کی نیت کے بارے شک میں مبتلا تو تھا لیکن وہ خیرات بانٹنے کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کپڑوں کی تقسیم محض اُن خواتین سے ملنے کا بہانہ ہے۔ کچھ خواتین نے کپڑوں کے تحفے قبول کر لیے اور اُن کی تیز رفتار گفتگو سننے کے لیے بھی تیار ہو گئیں۔ اُن کی اس گفتگو میں بلند آہنگ الفاظ اور پھیکی اور مکر وہ جذباتیت کے علاوہ کچھ نہیں تھا جو وہ جلدی جلدی ان خواتین پر مسلط کر رہے تھے۔

وہ سارے مرد پھڑ پھڑاہٹ کی حالت میں تھے اور اُن کی نیک تمنائیں اور عاجزی سب مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کے چہروں سے ہوس جنگل کی آگ کی طرح بھڑک رہی تھی جو اُن کی مسلمان بیویوں سے اس لیے بجھائی نہیں جا رہی تھیں کہ وہ ایک دوسرے سے واقفیت اور بیزاری کی بومحسوس کرتے تھے۔ وہ ہندو خواتین کو یقین دلاتے تھے کہ وہ انہیں کتنا چاہتے ہیں اور اُن کے لیے تڑپ رہے ہیں اور اُن کے لیے اُن کی محبت کتنی پاکیزہ اور خالص ہے۔ وہ قسمیں اٹھا رہے تھے کہ وہ اپنی پہلی بیویوں کو گھر سے نکال دیں گے اور ان (نئی بیویوں) کے ساتھ مطمئن زندگی گزاریں گے۔ یہ مرد اپنی نئی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا وعدہ کچھ اس طرح کرتے تھے کہ وہ انہیں اپنی پسند کے زیورات سے لاد دیں گے۔

وہ جنسی ہوس کی انتہا کے ہاتھوں بیتاب اور بے قرار تھے۔ جبکہ اُمید رکھتے تھے کہ اُن کی ہندو بیویاں اسے خلوص سمجھ کر قبول کر لیں گی۔ لیکن خواتین صرف ان کی باتوں سے محفوظ ہو رہی تھیں۔ کچھ نے دبی دبی ہنسی میں اُن کا مذاق بھی اڑایا لیکن پھر سنجیدہ ہو کر اُن کی ساری گفتگو کو سنا۔ وہ ٹھیکیدار کی نگرانی میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھیں اس لیے انہوں نے حملہ آوروں کے پاس واپس جانے سے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ ”وہ سب بہت جلد ہندوستان جانے کے لیے پُر امید ہیں۔“

حملہ آور شوہروں کو غیض و غضب کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ ان خواتین کو اپنی طاقت پر اس قدر یقین کہاں سے حاصل ہو گیا۔ جسمانی آسودگی کی اُمید سے مایوس ہونے کے بعد اُن کا مذہبی ضمیر بھی غضبناک ہونے لگا۔ ”اچھا تو کافروں کی بیٹیاں ہندوستان جانا چاہتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے جائیں گی۔“ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔

اسی اثنا میں یہ خبر بھی پھیل گئی کہ میں ان خواتین سے باتیں کرتی رہی ہوں۔ اس لیے انہوں نے فوراً نتیجہ اخذ کر لیا کہ دراصل وہ برائی کی جڑ میں ہوں۔ چنانچہ دیوانہ وار اچھل کود کرتے ہوئے وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ مجھے ساری زندگی کے لیے پاکستان میں روک لیا جائے کیوں کہ میں اُن کی نئی شادی شدہ زندگیوں کی خوشی غارت کرنے کی ذمہ دار ہوں۔

بعد ازاں انہیں ایک اور تدبیر بھی سوچھی۔ انہوں نے گاؤں کے لوگوں کے جوش و خروش کو یہ کہہ کر ہوا دی کہ ہندو خواتین کی پاکستان میں بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی جا رہی ہے جب کہ جموں میں مسلمان خواتین چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہیں اور انہیں اگلے مورچوں پر خنقیں کھودنے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ سادہ لوح دیہاتی آسانی سے اس فریب کا شکار ہو گئے اور انہوں نے گاؤں میں فتنہ اور فساد شروع کر دیا۔ کیمپ کمانڈر میرے کمرے میں آیا لیکن اُس کا ذہن کسی شک و شبہ میں مبتلا تھا۔ وہ کیمپ کی خواتین کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ مہربان ہو گیا۔ اکیلے نیکی کرنے والے کی حیثیت سے تنہائی کا شکار تھا اور اپنے مثبت اور نیکو کار طرزِ عمل کو مصلحت کے خلاف سمجھنے لگا تھا۔ ”آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ سارا گاؤں میرے خلاف ہو گیا ہے؟ میں نے آپ لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو میں کر سکتا تھا۔ لیکن کیا آپ جانتی ہیں کہ مسلمان خواتین کے ساتھ جموں میں کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”یہ سوال بہت مشکل اور گھمبیر ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو میں اسے بالکل سنجیدگی سے نہ لیتی۔ وہ بیقرار اور مایوس ہیں کیوں کہ وہ اپنی ہندو بیویوں کو واپس لے جانے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے بالکل یقین ہے کہ شیخ صاحب کسی صورت میں ایسے واقعات کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری بات سے قائل ہوا یا نہیں۔ شاید وہ اپنے آپ کو ایک نیک شخصیت کے روپ میں دیکھتے ہوئے واپس چلا گیا لیکن گاؤں کے لوگوں نے وقتاً فوقتاً اسے پریشان اور تنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک روز ایک ضلعی آفیسر کچھ گندم اور چاول لے کر آیا۔ گندم میں کیڑے پڑے ہوئے تھے اور پکے ہوئے

چاول باسی تھے۔ اُس نے یہ چیزیں کمانڈر کو دکھائیں اور کہا کہ۔ ”آپ اصرار کرتے ہیں کہ ہم ان خواتین کے لیے اچھی قسم کا راشن ارسال کریں۔ ذرا یہ تو دیکھیں کہ ہماری مسلمان خواتین کو جموں میں کیا ملتا ہے۔“

ایک دن ایک پندرہ سالہ لڑکی ایک سپاہی کے گھر سے برآمد کر کے لائی گئی۔ اُسے اُس کے شوہر اور اُس کے چچا جو مسلمان ہو گیا تھا، کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس لے جایا گیا۔ وہ دیوانہ وار پکار رہی تھی کہ ”میں کیمپ میں واپس نہیں جاؤں گی کیوں کہ وہاں ہندو خواتین ہیں جب کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔“ اُس وقت اوم بھی وہاں موجود تھا اور ڈپٹی کمشنر نے اُسے کہا کہ اس لڑکی کو کیمپ میں لے جاؤ۔ وہ بُری طرح چیختی تھی اور جانے سے انکار کرتی تھی۔ ”میں نہ تو ہندوستان جاؤں گی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز کھاؤں گی جسے آپ لوگوں نے پکایا ہو۔“ اُس نے بچے کی طرح چیختے ہوئے کہا۔

ایک خاتون نے کوشش کی کہ وہ معقولیت کا راستہ اختیار کر لے لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ دی اور مسلسل روتی رہی۔ وہ اس طرح روتی تھی جیسے کوئی زور زور سے قے کر رہا ہو اور ہر آہ سرد کی ہچکی کے ساتھ اپنی ساری نا اُمیدی اور مایوسی کو باہر پھینک رہا ہو۔

میں نے اُسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ میرے کمرے میں چلے اور یہ بھی کہ کوئی اُسے زبردستی ہندوستان جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ میں نے کہا۔ ”تمہیں کوئی بھی ہندوستان جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کیا فیصلہ کرتی ہو کہ تم کہاں رہنا چاہتی ہو۔“ ایک ایسے بچے کی طرح جسے پیار کر کے بہلایا گیا ہو، وہ خاموش ہو گئی۔ وہ گٹھڑی سی بن کر کمرے کے ایک کونے میں سو گئی اور اُس کی شریانیں کسی کوڑے کی رسی کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ اُسے کسی رحم کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس وہ رحم کے خلاف مزاحمت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی تحقیر نے رنج و غم کو اس کے دل کی گہرائیوں میں گلنے سڑنے کا موقع دے کر اُس کے لیے باعث اذیت بنا دیا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اُس کی روح دوبارہ کبھی بھی خوشی نہیں دیکھ سکے گی اور کوئی خوشی آس پاس موجود نہیں تھی جو اُس کے دل میں حرارت پیدا کر سکے۔ تاہم زندہ رہنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہونا ہی چاہیے تھا چنانچہ رنج و غم اور نا اُمیدی نے یہ خلا پُر کر دیا۔ ایسے میں یہ اقدار انسان کی سوچ و فکر کا حصہ بن جاتی ہیں اور جارحانہ تحقیر اُس کو مصنوعی طاقت فراہم کرتی ہے۔ جب میں نے دوبارہ اُس سے بات کی تو اُس نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آنسوؤں اب بھی اُس کے رخساروں سے نیچے بہہ رہے تھے۔ عقیدے کے پُر تشدد نقصان کے احساس کے لمحات گزر چکے تھے۔ ”کیا تم میرے ساتھ ٹھہرنا پسند کرو گی؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”میری بیٹیاں تمہارے ساتھ رہ کر بہت خوش ہوں گی۔ آؤ میں تمہیں اُن

کے نام بتاؤں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور ست روی سے میرے پیچھے چل پڑی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ مجھے اپنے بارے کچھ بتاؤ۔ اُس کی آنکھوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اچھی طرح پلی بڑھی ہے۔ اور جلد ہی اس بات کی تصدیق ہو گئی جب اُس نے اپنے باپ کا نام بتایا۔ اُس کا تعلق ایک مشہور خاندان سے تھا۔ جب وہ میر پور سے بھاگے تو اُس کا باپ اُس سے جدا ہو گیا۔ اُسے اپنی ماں اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ حملہ آوروں نے پکڑ لیا اور علی بیگ کیمپ میں پہنچا دیئے گئے۔ وہاں اُس کے ایک چھوٹے بھائی کو اونٹ نے کچل دیا اور وہ شدید درد اور اذیت کی حالت میں مر گیا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ بتا سکی اور اس کا جوان مگر لاغر جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی کسی غلیظ منظر کو دیکھ کر شدت سے جھنجھری لیتا ہے۔ میں نے اُس کی یادداشت کو ٹولا جس کی وجہ سے اُس کی روح ایک ایسے رنج و غم کا سامنا کرنے کی وجہ سے غم و کاشکار ہو گئی جس نے کمزوری اور بے ہمتی کے احساس کے ساتھ ساتھ اُسے مغلوبیت اور حقارت میں بھی مبتلا کر رکھا تھا۔ اُس کی خودی دیوانہ وار دوڑنے لگی اور اُس کی مرضی محض خودی کی خادمہ کے طور پر کام آئی۔ یوں لگا جیسے وہ خود اُن کی ذاتی زندگی میں مداخلت کا رہن گئی حالانکہ وہ اُن کے مشترکہ فیصلے کا بے بس شکار تھی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ اپنی جگہ سے ہٹ کر اُس کی پیشانی پر بکھر گئی جسے میں نے دوبارہ اپنی جگہ پر جمادیا اور اُس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

اُس نے اپنی کہانی دوبارہ شروع کی۔ ”کیمپ میں ہم نے بہت خوفناک مناظر دیکھے۔ مردوں کو نہر کے کنارے لے جا کر کلہاڑی سے اُن کے سرتن سے جدا کیے گئے۔ اور یہ سب انتہائی اچانک ہوا لیکن نہ کوئی پر تشدد غم و غصہ تھا اور نہ ہی افسوس اور پچھتاوا۔ لڑکیوں اور خواتین کو مسلمان اپنے اپنے گھروں میں لے گئے اور جب مرد اُن سے بیزار ہو گئے تو اُن لڑکیوں اور خواتین کو بارہ بارہ آنے میں حملہ آوروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جیسے اُن معذور جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو قابل استعمال نہیں رہتے۔“

پھر وہی کہانی۔ اگلے مورچوں کی طرف جاتے ہوئے حملہ آور بلا ناغہ علی بیگ کیمپ کے قریب ٹھہرتے تھے اور وسیع پیمانے پر کیمپ کی قیدی خواتین کے ساتھ جنسی آوارگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی اُن کی آوارگی اور بدکرداری کی نشاندہی کرے۔ کیوں کہ جو بھی ایسا کرتا تھا وہ اُسے گولی مار دیتے تھے۔ بچوں کو کھانے کے لیے بہت کم ملتا تھا اور وہ ہمیشہ مزید کھانا مانگتے رہتے تھے۔ جب انہیں کوئی ناقص راشن ملتا تو اجتماعی طور پر پیچش کے مرض کا شکار ہو جاتے۔ ”میری ماں کیمپ کی زندگی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور ایک دن کسی سپاہی کو بتایا کہ وہ وہاں سے کہیں جانا چاہتی ہے۔ اُس سپاہی نے مجھے دیکھ لیا



اور مجھے اپنے ساتھ جانے پر مجبور کیا۔ جب اُس نے اپنی بیوی اور والدین کو بتایا کہ میں بھی اُن کے ساتھ رہوں گی تو وہ غضبناک ہو گئے۔ اُن کے گھروں کی خواتین کو شاید علم تھا کہ اُن کے شوہر اُن سے تنگ آچکے ہیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب دوسری عورت ہندو ہو تو گھر میں اُس کے خلاف شکوہ شکایت لازمی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی اُن مقدس کتابوں کا غلط حوالہ دیتے تھے جو انہیں نسل در نسل زبانی موصول ہوتی رہی ہیں اور مطالبہ کرتے تھے کہ کافر عورت کو گھر سے باہر نکال کر کیمپ میں بھیج دیا جائے۔ لیکن یہ آدمی مجھے ایک اور گھر میں لے گیا اور کچھ عرصہ میرے ساتھ رہا حتیٰ کہ مجھے وہاں سے بازیاب کر لیا گیا۔“

میں اُسے سُدھا کہوں گی۔ سُدھا نے اپنا سر پیچھے پھینک دیا جیسے کسی پریشان کن خیال سے جان چھڑانا چاہتی ہو اور اپنی انگلیاں کن پٹیوں پر بکھرے ہوئے بالوں میں پھیرنے لگی۔ یہ کچھ وہ کسی غرور کی وجہ سے نہیں کر رہی تھی لیکن اُس کے انداز سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ بے حد بیقراری سے اپنے ماضی کی یادوں کو محو کرنا چاہتی ہے۔ مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ لوگوں کو اپنے بارے اچھی سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سُدھا کے ذہن کے عقبی گوشے میں کہیں یہ مبہم سا احساس موجود تھا کہ اُسے زندہ رہنے کے قابل بننے کے لیے اعتماد کی ضرورت ہے۔ انسان کو اپنی اُنا کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عذر کہ اُس کا وجود ہی نہیں بے سود ہے۔ یہ تصور بھی باعثِ تکلیف ہوتا ہے کہ آپ اپنی اُنا یا ذات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ پس منظر میں خفیہ طور پر منڈلا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلسل کام کر رہی ہے۔ دراصل ہر منظر کے پیچھے اصل طاقت وہی ہوتی ہے۔ بہر حال غیر جانبداری کی مختلف سطحوں پر اُنا کے ساتھ سمجھوتہ ممکن ہے۔

”تمہاری ماں کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا وہ اب بھی علی بیگ کیمپ میں ہے؟“ میں نے اُس سے

پوچھا۔

”نہیں۔ ایک کسان اُسے کیمپ سے لے گیا تھا اور اُسے تنگ کر رہا تھا کہ اُس کے ساتھ شادی کر لے۔ کچھ دن تو وہ مزاحمت کرتی رہی۔ لیکن بعد میں کسی اور اُمید کی عدم موجودگی اور اس آدمی کے تنگ کرنے کی وجہ سے اُس نے اپنے آپ کو آگ کے حوالے کر دیا۔ کسان کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی وہ کافی جل چکی تھی۔ اب چوں کہ وہ اس کے لیے بے سود تھی اس لیے اُس نے دوبارہ اُسے کیمپ میں واپس کر دیا۔“

پھر میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کیا تم ہندوستان جا کر اپنی ماں سے ملنا پسند کر دو گی؟ تم میرے ساتھ چل سکتی ہو۔“

جب میں نے ہندوستان کا ذکر کیا تو وہ پھٹ پڑی اور اُس کے اعصاب تھکن کی وجہ سے جواب دے گئے۔ اب مجھے احساس ہو گیا کہ وہ کمزوری اور نا اُمیدی کے باوجود مدد حاصل کرنے کے خیال کی مزاحمت



کر رہی ہے۔ اس لیے مجھے اُس کے ساتھ محتاط گفتگو کرنی چاہیے۔ اُس نے چیخنا شروع کر دیا اور کہا۔ ”آپ بھی بہت سے دوسرے لوگوں ہی کی طرح ہیں۔ شاید آپ بھی میری بہتری نہیں چاہتیں۔ آپ کا خیال ہے کہ وہاں (ہندوستان میں) میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا؟ وہ مجھے ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں کبھی بھی ہندوستان نہ پہنچ سکوں۔ وہ بھی مجھے قبائلیوں کے حوالے کر دیں گے۔“

اُس کے مسلمان شوہر نے اُسے قائل کر رکھا تھا کہ اب اُس کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ شوہروں کو تبدیل کرتی رہے۔ اس امکان اور منظر نے اُسے خوفزدہ کر دیا اور یہی وہ شخص چاہتا بھی تھا۔ اُس نے چاہا تھا کہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے ساتھ رہے۔ پہلے مسلمان شوہر کا خوف اور وحشت واقفیت اور قربت کی وجہ سے کسی حد تک کم ہو گئی! لیکن وہ اس سلسلے کو بار بار دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن اب صورتِ حال کسی حد تک آسان ہو گئی تھی۔ وہ نوجوان اور متاثر ہونے والی تھی اس لیے اُس نے میری کبھی ہوئی ہر بات سوال کے بغیر مان لی۔ اُس نے کہا کہ وہ ہر اُس جگہ جانے کے لیے تیار ہے جہاں میں اُسے لے جاؤں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کیمپ کے معمولات کے مطابق ڈھل گئی۔ میں نے جب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے اُس کے اندر اپنے لئے محبت کے طاقتور جذبے کا احساس ہوا۔ میں اپنے احساسات کی پیمائش تو نہیں کر سکتی تھی اور مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ میں اُس پر رحم کروں گی اُس پر رحم کرنے کا کتنا یقین تھا جو میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری بیٹیاں بھی اُس پر بہت مہربان تھیں اور ہم اُسے اپنے گھرانے کا حصہ سمجھتے تھے۔ اُس کا شوہر (نام نہاد) روزانہ کیمپ کے چکر لگاتا تھا اور مسلسل خطوط کے ذریعے اُس کی منت سماجت کرتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ واپس گھر چلے۔ جب اُسے معلوم ہو گیا کہ اُسے نظر انداز کیا جا رہا ہے تو وہ دوڑ کر گارڈز کے پاس جاتا اور انہیں چیخ چیخ کر پکارتا کہ اس لڑکی کو کیمپ سے باہر نکال دو۔ وہ اس موقف کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اب سدھا ہمیشہ کے لیے اُسے دھتکار چکی ہے۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ میری نگرانی میں ہے تو وہ دھمکی آمیز پیغامات کے ذریعے مجھے خطرناک نتائج سے آگاہ کرنے لگا کہ وہ لڑکی اگر اُسے واپس نہ کی گئی تو.....

کسی نے کیمپ نہیں چھوڑا بلکہ نئے نئے لوگ کیمپ میں آتے رہے۔ ایک دن ڈپٹی کمشنر کچھ ایسے لوگوں کو لے آیا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُن میں گوکل شاہ اور اُس کے بیوی بچے بھی تھے۔ وہ میر پورہی سے تعلق رکھتا تھا اور اچھا خاصا معروف آدمی تھا۔ حملہ آوروں نے اُس کے ایک بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ اس حقیقت نے کہ اب وہ مسلمان تھا اور پاکستان کی حکومت کی حفاظت میں تھا صورتِ حال میں ذرا بھی فرق نہیں ڈالا۔ کوئی

بھی حملہ آوروں کو روکنے کی نہ کر سکا جب وہ دندناتے ہوئے کیمپ میں داخل ہوئے اور گوگل شاہ کو اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے اُس کو اذیت دی اور مجبور کیا کہ وہ اُن کو وہ جگہ بتائے جہاں اُس نے کرنسی دبار کھی ہے۔ اُس پچارے نے جو کچھ اُس کے پاس تھا پہلے ہی دے دیا تھا۔ اُس نے بڑے صبر سے یہ بدسلوکی برداشت کی اور کہا کہ اُس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ جب وہ واپس آیا تو وہ جسم پر زخموں کے نشانوں کے بارے بہت حساس معلوم ہوتا تھا اور بار بار پہلو بدلتا رہتا تھا بلکہ کسی سے بات کرتے وقت زخم کے نشانوں کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ شاید یہ اس لیے تھا کہ وہ دوسروں کے دل میں اپنے لیے رحم کے جذبات پیدا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے بہت مددگار ثابت ہوتا تھا لیکن اپنے ذاتی مسئلے کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ اُس نے اپنے بارے صرف ایک بار مجھ سے بات کی اور وہ بھی برسبیل تذکرہ۔

گوگل شاہ کی ایک بیٹی تھی جس نے بمشکل اُنہی دنوں سکول چھوڑا تھا جب فساد شروع ہوا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُس کی شادی سعید نامی ایک مسلمان سے کر دی گئی۔ دو ماہ گزرنے کے بعد اُس کے شوہر نے محسوس کیا کہ اب بہت ہو چکا۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ اُسے سب سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ ایک اور اجنبی کے ساتھ رہنے کے خوف سے لڑکی نے سعید کی منت سماجت کی کہ وہ اُسے اپنے پاس رہنے دے۔ لیکن سعید نے اُسے فروخت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اُسی دوران نوجوان لڑکی نے بندوق استعمال کرنا سیکھ لی اور ایک دن جب وہ گھر میں اکیلی تھی تو اُس نے اپنی کپٹی میں گولی مار کر اپنا خاتمہ کر دیا۔ جب سعید واپس گھر لوٹا تو اُسے لڑکی کی لاش اپنی دہلیز پر پڑی ہوئی ملی۔ وہ خوش تھا کہ لڑکی نے خود ہی اُس کا مسئلہ حل کر دیا لیکن روپے حاصل کرنے سے محروم رہ جانے کی وجہ سے اُس نے لڑکی کے اقدام کو دھوکہ بازی قرار دیا۔ اُس نے لڑکی کی لاش کو اپنے گھر کے باہر پھینک کر سارے گاؤں والوں کو اُسے دیکھنے کی دعوت دی۔ وہ سب خوفزدہ تھے لیکن جب انہوں نے سعید سے اس کا ذکر کیا تو اُس نے صرف یہ کہا۔ ”کافر کی بیٹی کے ساتھ اچھا ہوا۔“

سُدھا اور یہ لڑکی بھی اُن بے شمار خواتین میں شامل تھیں جنہوں نے ایک ہی طرح عذاب الیم کا سامنا کیا تھا۔

ہمیں خبر موصول ہوئی کہ ہندوستان کی فوج آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم آزادی کے دن کے لیے پُر امید تھے۔ لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ پاکستانی پسپا ہوتے وقت ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ ایک روز ڈپٹی کمشنر کا بیٹا دوڑتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور کہا کہ مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مجھے ایسے کسی اور واقعہ کی یاد

نہیں آرہی جس نے مجھے اس طرح مکمل طور پر نا اُمید کر دیا ہو۔ میری مزاحمت اور مستقبل کی اُمید بالکل بے مقصد نظر آنے لگیں۔ پاکستان کے بارے سوچتے ہوئے میرا ذہن یہ خود تو صغنی کا تھا کیوں کہ میں اس بات کی قائل تھی کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے ٹھیک جا رہے تھے لیکن اب ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا گیا ہے اور ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ بزعیم خویش میرے صحیح راستے پر ہونے ہی کی وجہ سے تھا جس نے مجھے ان حالات میں بھی ہُ اُمید رکھا اور یہ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسی شخصیات تھیں جنہوں نے مجھ میں یہ احساس پیدا کیا۔ یہ چند روز پہلے کی بات تھی کہ گاندھی جی نے اُن لیے مرن بھرت رکھا تھا کہ ہندوستان میں تمام مذاہب اور قوموں کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور یکجہتی پیدا ہو۔ پھر یہ کتنا خوفناک اور شرمناک فعل ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ میں جانتی تھی کہ قاتل ایک پاگل آدمی تھا اور میرے ملک میں وہ ایک تنہا آواز تھی۔ اسی لیے مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے مجھے اور دیگر ہندوؤں کو جو پاکستان کے کیمپوں میں قید ہیں، کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ ہم نے اس دکھ درد میں بھی اپنے سرفخر سے بلند رکھے تھے۔ یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر کا بیٹا بھی متاثر دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر ہندوستان جانے کے لیے ہمارا وقت آ گیا۔ ڈاکٹر اور کئی دوسرے جو مسلمان ہو گئے تھے انہیں پاکستان ہی میں رہ جانے کے لیے کہا گیا۔ وہ میرے کمرے میں آئے اور اس موقف کے حق میں دلائل دیئے کہ اگرچہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں پھر بھی ہندوستان میں اُن کی زندگی آسان رہے گی۔ میں نے کیمپ کمانڈر سے اس کا اظہار کیا اور اُسے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا اور بالآخر وہ بھی اس بات پر راضی ہو گئے کہ ڈاکٹر اور اُس کے دوستوں کو بھی ہندوستان بھیج دیا جائے۔

ہمارے گروہ میں بہت سی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں تھیں جس کی وجہ سے مجھے سفر کے منظر نامہ سے خوف آتا تھا۔ کیمپ کمانڈر نے مجھے پاس سے گزرتے ہوئے روکا اور سرگوشی میں کہا۔ ”یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ ان سب خواتین کو لے کر ہندوستان جا رہی ہیں لیکن راستے میں آپ کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک سپاہی اور کوئی ایک پولیس آفیسر یہ منصوبہ بنا چکے ہیں کہ وہ ان دو لڑکیوں کو اغواء کریں گے جن کی آپ دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں۔“ میں نے کیمپ کمانڈر کا مسر فاناہ حد تک شکریہ ادا کیا اور جب میں اُس سے رخصت ہونے کے لیے اجازت لینے لگی تو صرف اتنا کہہ سکی۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے کہ ایک دوست کی محفل سے رخصت ہونا پڑ رہا ہے۔“ مجھے خوشی ہے کہ اُس نے بھی اسے ایک ناکافی بیان کے طور پر ہی قبول کیا۔

میں نے اُن دونوں لڑکیوں سے کہا کہ وہ اپنے بالوں کی تہہ (Plaits) کو کھول دیں تاکہ اُن کے

بال جھال کی طرح اُن کے چہروں کو ڈھانپ دیں۔ اُنہوں نے دو پرانے کبل بھی اپنے ارد گرد پیٹ لئے اور انہی سے سر بھی ڈھانپ لئے اور تاریکی میں ایک موٹی اور چھوٹی بوڑھی خاتون کی طرح چلتے ہوئے دکھائی دیئے لگیں۔ اور اب تاریکی بھی پھیل چکی تھی۔

پاکستانی فوج کے سپاہی قریب سے گزرتی ہوئی ہر خاتون کے چہرے کو غور سے دیکھتے تھے لیکن جن لڑکیوں کو وہ تلاش کر رہے تھے، وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ بلکہ کبلوں کے نیچے کانپتے ہوئے پہلے ہی گزر چکی تھیں۔

کھلے آسمان تلے کھیتوں سے گزر کر ہمیں گاڑی پکڑنے کے لیے سڑک پر پہنچنا تھا۔ ہم نے پہلا پڑاؤ تو مکمل کر لیا تھا جب کہ ہوا بہت تیز اور سرد تھی۔ کئی ٹرک وہاں ہمارا انتظار کر رہے تھے جن کے ساتھ ریڈ کر اس کے ورکرز، جن میں دو خواتین اور ایک مرد تھا، بھی تھے جو ہمیں الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔ جوں ہی خواتین ٹرکوں پر سوار ہوئیں میں نے ایک ایک کر کے اُن سب کی گنتی کی۔ ہم سب مردوں اور بچوں سمیت ایک سو اسی لوگ تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں آخری ٹرک میں بچوں، سُدھا اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھوں گی۔ تمام ڈرائیور مسلمان تھے اور ہر ٹرک میں چند سپاہی بھی نگرانی کے لیے موجود تھے۔ ہم نے بمشکل سفر شروع کیا تھا کہ ہمارے ٹرک کو روک لیا گیا۔ قبل اس کے کہ ہمیں معلوم ہو کہ کیا معاملہ ہے دو آدمی ٹرک پر چڑھ گئے۔ ڈرائیور اُن کو جانتا تھا اور وہ بھی اُس کی تلاش میں تھے۔ اُن میں سے ایک کسان نظر آتا تھا اور دوسرا دردی پوش سپاہی تھا۔

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور کہا۔ ”آپ کو مجھے بچانا ہوگا۔ یہ وہی ہے جو میرا شوہر ہونے کا مدعی ہے۔ اور اب وہ یہاں پہنچ گیا ہے۔“ اسی اثنا میں وہ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہر لمحہ کسی ایسے ناخوشگوار واقعہ کی توقع میں گزرتا تھا کہ اگر وہ واقع ہو گیا تو میں لڑکی کو سپاہی سے بچا کر لے جانے کے لیے کچھ نہ کر سکوں گی۔ لیکن بس مسلسل سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ سپاہی اچانک اپنی سیٹ سے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں اس لڑکی کی وجہ سے کس مصیبت میں مبتلا رہا ہوں؟ میرا سارا خاندان اب میرے خلاف ہے لیکن میں اُسے یہ اختیار دیتا ہوں کہ یہ جو چاہے کرے۔“

اُس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بالکل غیر رسمی طور پر اُس نکتے پر آ گیا جو اُس کے ذہن میں سب سے اوپر تھا۔ لیکن مجھے اپنے خیالات کو کھنگالتے ہوئے اور یہ سمجھنے میں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے چند لمحے تک انتظار کرنا پڑا۔ مجھے یہ محسوس کر کے بے حد اطمینان ہوا کہ سپاہی اس لڑکی کے خلاف پُر تشدد عزائم نہیں رکھتا اور وہ درحقیقت اُس کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ یہ واقعہ گاندھی جی کی شہادت کے بعد پہلا حوصلہ افزا واقعہ تھا جس سے انسانیت کے



بارے میرا کمزور ہوتا ہوا عقیدہ از سر نو بحال کر دیا۔ گزشتہ کئی ماہ سے کئی مراحل پر میں اس قدر مایوس ہو گئی تھی کہ میں نے لوگوں پر اعتماد کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی مایوس ہو گئی تھی۔ تمام اُمیدوں سے محروم ہونے کے علاوہ ایک خود دارانہ خوف بھی ہوتا ہے کہ ہم نے جن اقدار کا انتخاب کیا تھا وہ سب غلط ثابت ہو گئی ہیں۔ ”ہاں، میں ساری کہانی جانتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر تمہاری طرح کے زیادہ لوگ ہوتے تو بہت سی لڑکیاں بچ سکتی تھیں۔ اگر تم نہ ہوتے تو یہ بے چاریلڑکی آج رات ہندوستان نہ جا رہی ہوتی۔“ اپنی گفتگو کے دوران یہ جاننے کے لیے کہ اُس کا رد عمل کیا ہے، میں مسلسل اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

ہم بمشکل چند میل آگے آئے ہوں گے کہ وہ دوبارہ بولا اور یہ تاثر بہت خوش کن تھا کہ اُس نے اپنے اُنہی جذبات پر زور دیا تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ اُس نے جو کچھ کہا تھا درست کہا تھا۔ اُس نے دوبارہ مجھے کہا کہ میں اس لڑکی کو ہندوستان لے جاؤں اور اس بات کا خیال رکھوں کہ اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جا رہی ہے۔ اُس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ میں اس کو اس کی والدہ کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد اُس نے ڈزائیور کو بس روکنے کے لیے کہا اور وہ اور کسان دونوں بس سے باہر نکل گئے۔ میں باہر ارد گرد دیکھتی رہی اور دیکھا کہ وہ ہمیں نرمی اور نزاکت سے دیکھ رہا ہے لیکن اُسے نہ تو کوئی افسوس ہے اور نہ ہی پچھتاوا۔

سرائے عالمگیر پہنچ کر ہم ایک ریل گاڑی پر سوار ہوئے جو علی بیگ کیمپ سے لائے گئے مہاجرین سے پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ مسز مودی، لڑکیاں ویمل اور میں سب ایک ہی ڈبے میں تھے۔ سریش اور ملازمین کو ہم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اُس کیرج میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے کہ اور کتنے لوگ اس میں ڈال دیئے گئے ہیں۔

جلدی میں کسی ایک نے دیا سلائی جلائی تو میں نے دیکھا کہ سونے کی تمام سیٹیں پُر ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے مسز مودی اور بچوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ کا انتظام کیا۔ ہم نے اس تاریک ڈبے میں جو بالکل پنجرے کی طرح تھا، کئی گھنٹے بیٹھ کر گزارے۔ ٹرین نے صبح چار بجے روانہ ہونا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ ایک سیاہ بادل کے پیچھے سے نکل کر نمودار ہوا اور اس کی ٹھنڈی اور کمزور روشنی میں میں اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے مدھم خط وخال دیکھ سکی۔ میں اپنے کیمپ سے جاگیردار کے خاندان کے لوگوں کو پہچان گئی۔ اُن کی ایک خاتون میری بیٹی شیدا کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بازوؤں میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ میری نگاہ گھومتے گھومتے کمپارٹمنٹ کے دوسرے کنارے تک پہنچ گئی اور بار بار ایک دیکھے بھالے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اچانک ایک خاتون کی چیخ نے مہر سکوت توڑ دیا۔ یہی وہ عورت تھی جو شیدا کے بالکل ساتھ بیٹھی ہوئی



تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی اُس کا بازو کھینچ رہا تھا۔ ”مجھے اس بچے کو کسی کے حوالے کرنے دو۔ پھر میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ وہ بین کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ اُس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو اُس عورت نے چھلانگ لگا کر ’برتھ‘ کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی۔ وہ آدمی پاکستانی فوج کا سپاہی تھا اور وہ اُس کی چالاکی سمجھ کر غضبناک ہو رہا تھا، جو خاتون نے اُس کے ساتھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے پسلیوں کے درمیان ایک تیز چھین محسوس کی اور ایک خنجر کی چمک بھی دکھائی دی۔ دو غضبناک آنکھوں نے میری آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور حلق سے نکلتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ کہ تم نے اُسے کہاں چھپا رکھا ہے ورنہ میں یہ خنجر آخری دعا کرنے سے پہلے ہی تمہارے سینے میں گھونپ دوں گا۔“ اُس نے نگا خنجر میرے چہرے کے بالکل قریب رکھ کر پکڑا ہوا تھا جو چاند کی روشنی میں تیل کی چمک دکھا رہا تھا۔ اب اُس کی نظر اچانک اُن لڑکیوں پر پڑ گئی جو دوسرے کونے میں گٹھڑی بنی ہوئی تھیں۔ مجھے دھکا دے کر وہ اُن لڑکیوں کی طرف چلا گیا۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے اُس نے پوچھا۔ ”یہ کس کی لڑکیاں ہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”میری“۔

اتنے میں اُس کی نظر اُس عورت پر پڑ گئی جسے وہ تلاش کر رہا تھا اور جو ’برتھ‘ کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ سپاہی نے اُسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اُس کی ماں نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور چیخیں مارنے لگی۔ آدمی گھبرا کر بھاگ گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس حادثے کے بارے بالکل نہیں سوچوں گی۔ میں ہندوستان کے بارے سوچنا چاہتی تھی۔ جلد ہی پو پھٹ گئی اور ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی امرتسر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک نیا دن، اور میں پُر امید تھی کہ ہم سب کے لیے ایک نئی زندگی شروع ہو چکی ہے۔



## پنڈت نہرو کے ساتھ ایک انٹرویو

جوں ہی ہم امرتسر پہنچے تو ٹرین نے ایک موڑ کاٹا اور میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ میں فکر مند چہروں کو لمبی ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بلکہ آخری بوگی کے آخری حصے تک نظریں گاڑے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ جوں ہی سٹیشن قریب آیا، ٹرین ذرا آہستہ ہوئی اور پھر جھنجھناہٹ کے ساتھ زور سے آگے کی طرف لپکی۔ جب رُکی تو میرے کمپارٹمنٹ کا ہر شخص پلیٹ فارم کو دیکھنے کے لیے باہر دوڑ پڑا لیکن میں مسلسل اور جان بوجھ کر اپنی جگہ پر ڈٹی رہی تاکہ میرا تجسس کچھ اور بڑھ جائے۔ میں نے نئی آزادی کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے ہوا کو سونگھا۔ اپنے وطن میں واپسی بہت اچھی لگی۔ اس کا مطلب خوف اور ذلت سے آزادی تھی اس لیے کئی ماہ کے بعد میں نے واقعی سکھ کا سانس لیا۔

لوگوں کا ہجوم تھا۔ دوست، رشتہ دار، سماجی کارکن اور اُس کیمپ کی انتظامیہ جہاں ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے اور خوش خلقی کا اظہار کر رہے تھے۔ پھر جوں ہی مہاجرین ٹرین سے اترے تو یہ لوگ اُن کا استقبال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ مکمل درستگی کے ساتھ کام کر رہے تھے اور ایک کیرج سے دوسرے کیرج کی طرف دوڑ کر جا رہے تھے اور چند ہی منٹوں میں ہماری دیکھ بھال شروع ہو گئی۔ اُنہوں نے ہمارے کھانے کے لیے بہت سی چیزیں لائیں اور اس کے علاوہ مٹھائی اور پھل فراوانی کے ساتھ فراہم کیے گئے۔ یہ چیزیں ہر طرف پھیلا دی گئیں اور جلد ہی کھانا غائب ہو گیا۔ کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ کس نے کتنا کھایا ہے۔ ہم بھوکے تھے اور وہ لوگ ہماری تواضع کر رہے تھے جن کی مہمان نوازی ہمارے لیے قابل قبول تھی۔ اس کے برعکس مجھے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے کیمپ میں خواتین کے بچھے ہوئے چہرے یاد آ رہے تھے جب وارڈز اپنے روزانہ کے دورے پر آ کر کھانا تقسیم کرتا تھا۔ میں بھی بھوکے تھی لیکن کھانے کے معاملے میں ہمیشہ کی طرح ٹال مٹول کرتی رہی۔ مجھے احساس تھا کہ میں اس ارفع لمحے کے ذائقے کو اپنے خلق میں برقرار اور محفوظ رکھنا چاہتی تھی اور میں جانتی تھی کہ کیوں؟ میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنے ماضی کو اس کے سارے دکھوں اور زیادتوں سمیت

پہلے ہی ہضم کر لیا ہے۔ روح اتنی مغرور تھی کہ وہ جسم کی تلخیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے ماضی کا سارا زیاں تجربے کا لازمی حصہ معلوم ہونے لگا۔ ایسے میں وہ رشتہ دار بھی جو تسلی دینے کے لیے آئے تھے خوشی کے ماحول کو ضائع کرنے کا باعث بن گئے اس لیے میں نے ماضی کو گھر چنے پر اُن سے ناراضگی کا اظہار کیا۔

میں نے سنا کہ کشمیر کے تمام مہاجرین کو 'کرک شیٹرا' (Krrukshtra) کے کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے۔ یہ جگہ وہ مشہور میدانِ جنگ ہے جہاں پانڈوؤں اور کوروؤں نے خدا کی ہدایت کی روشنی میں ایک خونِ جنگ لڑی تھی۔ اس کے نتیجے میں دُنیا میں عدل و انصاف بحال ہوا تھا اور بھگوت گیتا انسان کی نئی نسلوں کے حوالے کی گئی تھی۔ میں بذاتِ خود وہاں جانے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور کچھ وقت کے لیے امرتسر ہی میں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن میں وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی جو مجھے کچھ دن کے لیے وہاں ٹھہرا سکے۔ اتنے میں 'کرک شیٹرا' کیمپ کی انتظامہ کی ایک خاتون میرے پاس آگئی۔ کیا تم کرک شیٹرا جانے کے لیے ٹرین نہیں پکڑ رہی؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔ جب میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے سمجھا کہ میں وہاں جانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ اُس نے مزید کہا۔ "مقامی کالج میں ایک کیمپ میری نگرانی میں چل رہا ہے اور چوں کہ آپ یہاں ٹھہرنے کو ترجیح دیتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں، اس لیے میں کوشش کروں گی کہ میں آپ کو کچھ دن کے لیے یہاں ٹھہراؤں۔ لیکن اس کے لیے مجھے حکامِ بالا سے اجازت حاصل کرنا پڑے گی۔ اور اگر انہوں نے آپ کی درخواست کو مسترد کر دیا تو آپ میری مہمان کی حیثیت سے ٹھہر سکتی ہیں۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اُس کا نام بی بی سنت کور ہے۔ وہ پینتالیس سال کے پیٹے میں ایک خوش گفتار خاتون تھی۔ میں نے اپنے دیگر ساتھی مسافروں کو الوداع کیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ میں کرک شیٹرا کیمپ میں اُن سے ملنے جایا کروں گی۔

ہمیں اُس کمرے کے ساتھ والا کمرہ دیا گیا جس میں بی بی سنت کور رہائش پذیر تھی۔ اور وہ ہمیں آرام دہ رکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کیمپ میں ہندو اور مسلمان خواتین رکھی گئی تھیں۔ اغواء شدہ مسلمان خواتین بازیابی کے بعد اُس وقت تک یہاں رکھی گئی تھیں جب تک انہیں پاکستان یا ہندوستان میں ان کے رشتہ داروں کے حوالے کیا جاتا۔ اسی طرح اغواء شدہ ہندو خواتین جو پاکستان سے واپس پہنچی تھیں کو بھی اُس وقت تک یہاں رکھا گیا تھا جب تک وہ رشتہ داروں کے حوالے کی جاتیں۔ یتیم بچوں کی مستقل کفالت ریاست کی ذمہ داری تھی۔ کیمپ کی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور خواتین ملازم ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے سنبھال کر رکھ رہی تھیں۔ خواتین کو دودھ اور پھل باقاعدگی سے روزانہ ملتے تھے۔ کیمپ کی انتظامیہ نے سلائی اور کڑھائی کی کلاسوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا جس میں کشیدہ کاری کے علاوہ سینا پروتا

بھی سکھایا جاتا تھا۔ نزدیک ہی ایک سینما بھی تھا جس میں ہم سب ہفتے میں دو مرتبہ فلم دیکھتے تھے۔ زندگی بے حد آسان اور آرام دہ ہو گئی تھی لیکن خواتین میں پھر بھی بے توجہی اور بیکاری کا احساس موجود تھا۔

بی بی کور نے مجھے مطلع کیا کہ ایک ٹرین مظفر آباد سے مہاجرین کو لے کر آرہی ہے جو چار بجے سہ پہر یہاں پہنچے گی اس لیے وہ سٹیشن پر جا رہی ہیں۔ میں نے بھی اُس کے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ ہم ذرا جلدی وہاں پہنچ گئے اور پہلے کی طرح آج بھی مہاجرین کا استقبال کرنے کی مکمل تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ مظفر آباد سے کئی آنے والوں جنہیں میں اچھی طرح جانتی تھی، سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ اُن میں چمن لال بھی تھا۔ وہ اب امرتسر میں تھے اور 'کرک شیٹرا' کمپ کی طرف جا رہے تھے۔ چمن لال اور میں نے اُس کی روانگی سے قبل اپنے اپنے نوٹس ایک دوسرے کو دکھائے۔ مظفر آباد میں صورت حال یقینی طور پر روبہ اصلاح نہیں تھی۔ مسز مودی اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے کے لیے سری نگر کوچ کر گئی تھی۔

چند روز بعد ہم بھی 'کرک شیٹرا' چلے گئے اور بی بی کور نے مجھے کیمپ کمانڈر کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا جس کا نام کرنل پوری تھا۔ کرنل پوری نے گرجوٹی سے ہمارا استقبال کیا اور ایک خیمہ بھی دیا جو صرف ہمارے لیے تھا۔ اس کیمپ میں تقریباً دو لاکھ مہاجرین تھے اور میرے لیے یہاں ایڈجسٹ (باقاعدگی اختیار کرنا) ہونا بہت آسان تھا۔ میں اُن لوگوں کے ساتھ جنہیں میں اچھے دنوں سے جانتی تھی واپس آ کر بہت خوش تھی جن میں شیوا دیال، چمن لال اور مظفر آباد ہی سے کئی دوسرے شامل تھے۔ کرنل پوری ہمیشہ کیمپ کے معاملات میں مصروف رہتا تھا اور اُس کی بیوی اور دو بیٹیاں بھی مختلف کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اُس نے میرے لیے بھی کیمپ میں کچھ نہ کچھ مفید کام کرنے کا انتظام کر لیا تھا۔

مجھے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ ہمارے اطمینان اور آسانی کا سب سے بڑا سبب کیمپ کا ہمدردانہ ماحول تھا۔ نہ تو وہاں جنگ کے بارے گرما گرم باتیں ہوتی تھیں اور نہ ہی خوف لوگوں کے ذہنوں میں غلاظت بھر سکتا تھا اور عورتوں کو بھی بلی کی طرح کی خصوصیات کی نمائش کرنے کی ضرورت درپیش نہ تھی۔ سیاسی راہنماؤں میں بھی یہ عزم پایا جاتا تھا کہ وہ آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے اہل ہیں اور مقابلہ کر کے ان کا حل نکال لیں گے۔ لیکن کیمپ میں ایک ایسی خاموش رضا مندی کا عالم تھا کہ کوئی جارح کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وعظ و نصیحت بالکل نہیں تھی لیکن ہر شخص کو یقین دلادیا گیا تھا کہ سب سے اہم بات زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا ہے۔ جب ہم پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں تھے تو جہاد کے امکانات بہت خوفناک تھے لیکن یہاں دنیا ہمیں صرف ہنسنے کا سبق دیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہندوستان میں کوئی بھی شخص ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔



میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کا انٹرویو کرنے کی اجازت کے لیے کہا ہوا تھا اور اس مقصد کے لیے دہلی جانے کے لیے پُر امید تھی۔ لیکن ایک دن کنٹرل پوری نے مجھے بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کیمپ میں آرہے ہیں اور وہ مجھے بھی ملیں گے۔

پنڈت نہرو تشریف لے آئے۔ مجھے اُن کے پاس لے جایا گیا۔ ہندوستان کا وزیراعظم سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور تقریباً ایک منٹ تک میں کچھ کہے بغیر اُن کے سامنے کھڑی رہی۔ میں مرعوب نہیں تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ بات کیا کروں۔ مجھے اس بات پر کافی تعجب ہوا کہ خاموشی خاموشی ہی میں نے اپنے ماضی قریب کے چند ماہ کے تجربات کی تفصیل کو اپنے ذہن میں ترتیب دے ڈالا۔ یہ کسی بڑی شخصیت کی موجودگی میں اکثر ہو جاتا ہے کیوں کہ آپ کے ساتھ اُس کی خاموش افہام و تفہیم (Understanding) آپ کے یقین اور اعتماد کو پختہ اور مضبوط کر دیتی ہے۔ آپ کو اس لیے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی کیوں کہ یہ سب کچھ فرض کر لیا جاتا ہے۔ اور آپ کو ہمیشہ اُمید ہوتی ہے کہ آپ کو اُن کہی باتوں کی وجہ سے جانچا اور تولا جائے گا۔

اپنے استغراق سے میری خوشگوار توجہ اُس وقت مبذول ہوئی جب میں نے سنا۔ ”کیا آپ بیٹھنا پسند کریں گی؟ اور مجھے اپنے بارے کچھ بتائیں۔“ یہ ایک بہت شیریں آواز تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ جوا نہیں سننے جاتے تھے کیوں کہ پُر اُمید ہو کر واپس آتے تھے۔

میں نے اپنی کہانی کے وسیع خط و خال، تجربات و مشاہدات اُن کے سامنے بیان کئے اور جب میں نے اپنے بچوں کا ذکر کیا تو انہوں نے اُن سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ شام کو چائے پر کنٹرل پوری کے گھر آئے اور اُن کی دعوت پر میں وہیں سے اُن کے ساتھ ہی اُن کی کار میں دہلی روانہ ہو گئی۔ مجھے ٹھہرنے کے لیے مہمان خانے کا ایک کمرہ دیا گیا۔ پنڈت نہرو کہیں باہر کھانے پر گئے ہوئے تھے اور جب واپس آئے تو مجھے ملے۔ اُنہوں نے کہا۔ ”کرشنا! تمہیں اب اپنے آپ کو ہمارے خاندان کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ میں تمہارے بچوں کو سکول بھیجنے کا انتظام کروں گا۔“

ایک ہفتے کے بعد میں ’کرک شیٹرا‘ گئی تاکہ اوم اور بچوں کو دہلی لے کر آ جاؤں۔ ہم وہاں تقریباً دو ماہ تک ٹھہرے رہے اور اس دوران سمر گاندھی بے حد مہربان اور فکر مند رہی۔ بچوں کو نینی تال کے ایک سکول میں بھیج دیا گیا۔ مئی 1948ء میں کشمیر کے دورے کے دوران میں بھی پنڈت نہرو کے ساتھ وہاں گئی جہاں انہوں نے میرے لیے کام تلاش کر لیا۔ ایک ’سادن‘ کشمیر کی خواتین کو گھریلو دستکاریاں سکھانے کے لیے قاعدہ کلاسیں لیتی تھی۔ میرا بھائی جو چھ ماہ کی رخصت پر تھا اور مجھے ملنے کے لیے آیا تھا میرے لیے بہت مددگار ثابت



ہوا۔ شروع شروع میں لوگوں کا رد عمل کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا لیکن چھ ماہ کے عرصہ میں ادارہ نے تیز رفتاری کی اور پانچ سو سے زیادہ خواتین کے لیے زندہ رہنا ممکن بنا دیا۔ اس کی تین شاخیں۔ بارہ مولہ، ہبک باد، چٹی بادشاہی، میں قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ 'سازن' کے تحت محتاج بچوں کے لیے ایک 'مانٹیویری سکول' بھی شروع کیا گیا۔ بلکہ ہسپتال بھی قائم کیا گیا جسے انڈین آرمی کا شاف چلاتا تھا۔

تقریباً انہی دنوں میں نے سنا کہ میری بہن لکشمی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بھی کشمیر ہی میں تھی اور اُس کا شوہر حملہ آوروں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور لکشمی اس صدمہ سے کبھی باہر نہ آ سکی اور بالآخر جان کی بازی ہار گئی۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین بچے چھوڑے تھے۔ میں نے اپنے شوہر اور لکشمی کے علاوہ بھی بہت کچھ کھویا تھا اور اس لیے میری یادداشت پر دیگر کئی زخموں کے غلیظ نشان بھی تھے۔ لیکن میں جس ابتلا سے نکل کر آئی تھی اُس کے مقابلے میں ذرا بہتر محسوس کرتی تھی۔ میں دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے اور کبھی کبھی اُن کے کام آنے کی وجہ سے بھی بے حد شکر گزار تھی جو شاید خود رنجی (Self pity) کا واحد علاج ہے۔ میں ایسی صورت حال اور ایسے لوگوں کی جن کے درمیان رہ کر میں نے شکست کے تلخ ذائقے کو محسوس کیے بغیر جھکنا سیکھا، بے حد شکر گزار ہوں۔

مجھے ٹھیکیدار کے کیمپ کے دو حادثات خاص طور پر یاد آئے۔ جن مناظر کو میں اب بھی چشم تصور سے واضح اور شعوری طور پر دیکھتی ہوں اور یاد کرتی ہوں بلکہ دیکھتی ہوں کہ جب ایک عورت کے بازوؤں میں بیمار بچہ تھا اور وہ اندر اور باہر کے ہر دکھ درد کو بھول کر اور ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر بچے کو بہلا رہی تھی۔ اور دوسرا یہ کہ ٹھیکیدار نے اس قدر اصرار کیا کہ میں اُس عورت کی اچھی طرح دیکھ بھال کروں جو شدید قسم کے پیچش کے مرض میں مبتلا تھی۔ وہ مجھے اُس کا کمرہ تو صاف نہیں کرنے دیتا تھا اور جب بھی میں ایسا کرنے لگتی تھی تو وہ معذرت کے الفاظ منہ میں دھراتے ہوئے مجھے ایک طرف دھکیل دیتا تھا۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ اُسے اپنے آپ پر اعتماد نہیں تھا بلکہ یہ اس لیے تھا کہ قدرت نے اُسے حقیقی اور فطری عجز و انکسار سے نواز رکھا تھا اور اُس نے کبھی اپنی تسلی و تشفی کے لیے مسئلے کا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ایسے لوگوں کے بارے کسی مصنف اور ماہر نفسیات نے آخری بات کہنے کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ انسان کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو جاننے اور اُن میں رہنے کی رعایت حاصل کرنے پر فخر محسوس کرے۔ لیکن مجھے صرف ایسے لوگوں کو ہی یاد نہیں کرنا بلکہ بہت کچھ یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔ بے شمار حادثات اور اس نوع کے لوگوں کی درائٹی سب مل کر میری یادداشت میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ دراصل اس مختصر سے وقت میں اتنے ڈھیر سارے تجربات کا قدرتی طور پر یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔